جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون:

ایڈیٹر: ۷۴۲۵۸   منیجر: ۷۴۴۷۰

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبعہ: یونین پریس دہلی   ٹائٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

جولائی ۱۹۶۵ء میں رچنا پرکاشن (نئی دہلی) نے انگریزی میں موہن رام کی ایک کتاب شائع کی ہے، کتاب کا نام ہے 'HINDI AGAINST INDIA'، کچھ تلخ حقیقتیں ہیں جنھیں مصنف نے جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے، وہ جنوبی ہندوستان کے رہنے والے ہیں، عمر ۳۶ سال سے زیادہ نہیں، انداز بیان صحافتی اور جذباتی ہے، غصہ اور جھلاہٹ بھی نمایاں ہے، ایسی صورت میں حالات اور واقعات کے کسی معروضی تجزیے کی توقع بے سود ہے، اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت ملک میں ایسے عناصر پوری قوت سے کارفرما ہیں جن سے تعمیر کے بجائے تخریب کی قوتوں کو بڑھاوا مل رہا ہے، ہر محب وطن کا دل اس پر دکھتا ہے، لیکن اس صورت میں تو اور بھی متوازن طرز فکر کی ضرورت ہے، ایک قسم کی انتہاپسندی کا جواب دوسری طرح کی انتہاپسندی سے دیا جائے تو کام بنتا نہیں اور بگڑتا ہے، موہن رام صاحب کا نظریہ ہے:

۱۔ "ہندوستانی قومیت ابھی اپنی تشکیل کے دور سے گذر رہی ہے اور متضاد اور متصادم رجحانات کا عمل جاری ہے۔"

۲۔ "ہندوستان کے اتحاد اور یکجہتی کے لئے ہندی اور وہ سب کچھ جس کی نمایندگی ہندی زبان کرتی ہے، سب سے بڑا خطرہ ہے، ہندی کا مسئلہ کوئی لسانی مسئلہ نہیں ہے، یہ سیاسی مسئلہ ہے، ہندی اُس تحریک کی ہراول ہے جس کے ذریعہ وسطی ہندوستان کے ہندی بولنے والے لوگ ملک پر غلبہ اور اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

۳۔ "... آیندہ ہندوستان میں جو تنازعہ اور تصادم ہوگا وہ نسبتاً پسماندہ ہندی بولنے

والے وسطی ہندوستان کے علاقے اور ترقی یافتہ ساحلی علاقوں کے مابین ہوگا کیونکہ ہندی زبان کے علاقے نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ اس برصغیر پر اسی کا سیاسی اور تہذیبی اقتدار ہونا چاہئے، ہندی کا مسئلہ ہوتا یا نہ ہوتا، یہ تنازعہ ضرور اُٹھتا اور بڑھتا۔"

اپنے دیباچہ میں یہ مقدمات قائم کرکے انھوں نے ڈی، ایم، کے، کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ تحریک ہندوستان میں ایک نئے چیلنج کی علامت ہے، جس لہجہ میں یہ چیلنج پیش کیا گیا ہے وہ تلخ ہو لیکن اس قسم کے خیالات اور طرز گفتار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جو لوگ صحیح خطوط پر قومی اتحاد اور یکجہتی کا کام کر رہے ہیں یہ باتیں ان کے لئے ایک چیلنج کا حکم رکھتی ہیں، مصنف نے اپنی پسند کے اقتباسات، غالباً سیاق وسباق کو نظرانداز کرتے ہوئے، دستور ساز اسمبلی کے مباحثوں، پارلیمنٹ کی تقریروں، نامہ نگاروں کے مراسلوں اور مختلف کمیشنوں اور کمیٹیوں کی رپورٹوں وغیرہ سے چن لئے ہیں اور اُن کی مدد سے اپنے قائم کئے ہوئے مقدمات کو صحیح اور برحق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں اردو زبان کا ذکر بھی بار بار آیا ہے اور اس طرح آیا ہے کہ ہندی والے اُردو کے دشمن ہیں اور انھوں نے اُردو کو ختم کردیا ہے، حالانکہ اُردو کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ سارے کا سارا تنگ نظر سیاست کا کھیل ہے، ہمارا خیال ہے کہ ہندی۔ اُردو کا کوئی لسانی جھگڑا نہیں اور ہندی کے ادیبوں اور شاعروں میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھیں اردو سے کوئی بیر نہیں۔ مصنف نے غالباً دانستہ اس بارے میں کچھ نہیں کہا ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، بے شمار ہندو اور سکھ اِس زبان کو بولتے ہیں اور اس کی کتابیں اور اخبارات پڑھتے ہیں، کتاب میں (صفحات ۵۰۔۵۲) اردو زبان کی داستان غم جس طرح بیان کی گئی ہے، وہ کچھ اس طرز پر ہے۔

ہندوستان میں ہندو اکثریت ایک مستقل اکثریت اور دوسرے فرقے مستقل اقلیتوں کی حیثیت میں ہیں، اکثریت کے لئے یہ آسان ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر فرقہ وارانہ کہے اور قوم پروری کے نام

.برایسے کام کرے جو فرقہ وارانہ نوعیت کے ہوں، آزادی کے بعد اردو زبان کو جن دشواریوں کا سامنا رہا ہے اُن سے ہندی نیشنلزم کے فرقہ وارانہ کردار کی تصدیق ہوتی ہے، آندھرا پردیش میں اگرچہ ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ کی آبادی میں اردو بولنے والوں کی تعداد صرف ۲۵ لاکھ ہے، اِسے ریاست میں ثانوی سرکاری زبان کی حیثیت دی گئی ہے، لیکن اتر پردیش میں جہاں یہ اسّی لاکھ انسانوں کی زبان ہے، اس کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں، ۱۹۶۷ء کے انتخابات کے موقع پر کانگرس کو یہ پریشانی تھی کہ شاید ہندی ریاستوں میں اُردو زبان کے مسئلہ کی وجہ سے کانگرس کو مسلمانوں کی تائید نہ حاصل ہو سکے، یونین منسٹر فخر الدین علی احمد صاحب نے ۶ر جولائی ۱۹۶۶ء کو اپنی ایک رپورٹ میں جو صدر کانگرس کو پیش کی گئی تھی، کہا تھا کہ کانگرس سے مسلمانوں کی بدظنی اور علاحدگی کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ "اتر پردیش، بہار اور دہلی میں علاقائی زبان کی حیثیت سے اردو کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔" انتخابات کے بعد رانچی میں اردو کے مسئلہ پر ایجی ٹیشن ہوا جس کے نتیجہ میں بہت بڑا اینٹی مُسلم فساد رونما ہوا۔

آزادی کے فوراً بعد ہی سے شمالی ہندوستان میں اردو کو اسکولوں سے نکال دیا گیا اگرچہ جنوب میں اردو کی حفاظت کی جاتی رہی۔ مدھیہ بھارت میں جو بعد میں مدھیہ پردیش کا حصہ بن گیا ۱۹۴۹ء میں ایک قانون کے ذریعہ یہ کہہ دیا گیا کہ سرکاری کاموں میں دیوناگری رسم خط کی ہندی کے علاوہ کسی دوسری زبان کا استعمال جرم ہوگا۔ پنجاب گورنمنٹ نے ایڈمنسٹریشن اور پبلک ایجوکیشن میں اردو کے استعمال پر پابندی لگادی، مئی ۱۹۴۹ء میں اتر پردیش نے فیصلہ کیا کہ بچوں کو صرف ہندی زبان میں تعلیم دی جائے گی، ۱۹۵۹ء میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے قلمبند کیا کہ وہ بچے جن کی مادری زبان اردو ہے اتر پردیش میں اپنی زبان نہیں سیکھ سکتے، البتہ وہ چھٹی جماعت کے بعد بطور ایک اختیاری مضمون کے اِسے پڑھ سکتے ہیں، اُن اسکولوں میں بھی جو لسانی اقلیتیں چلاتی ہیں اُردو کو تعلیم کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ عرصہ سے بہار اور اتر پردیش میں یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اُردو کو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے، ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی اردو نے اتر پردیش کے ۲۰ لاکھ ۵۰ ہزار شہریوں کے دستخطوں کے ساتھ صدر جمہوریۂ ہند کی خدمت میں یہ عرضداشت گذاری تھی کہ دستور ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت وہ یہ

ہدایت جاری فرمائیں کہ اس ریاست میں اُردو کو علاقائی زبان کا درجہ دیا جائے، ۱۹۵۶ء میں بہار کے ۱۰ لاکھ شہریوں نے بھی اسی طرح کی ایک عرضداشت بھیجی لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اُردو کے ساتھ مرکزی حکومت نے جس بے رخی کا برتاؤ کیا اس سے تہذیبی حقوق سے متعلق دستور ہند کی دفعات کے بارے میں شبہات پیدا ہوگئے، زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی تنظیم کے ساتھ (۱۹۵۶) اُردو کا مسئلہ لسانی اقلیتوں کے عام مسئلے کا ایک جز و بن گیا، لیکن ہندو اکثریت اردو کو ایک فرقہ وارانہ مسئلہ ہی سمجھتی رہی، مئی ۱۹۵۸ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے یہ تسلیم کیا کہ اردو کے بارے میں شبہات پیدا ہوگئے تھے، اردو اگرچہ ایک بڑی تعداد کے لوگوں کی مادری زبان ہے لیکن کسی ریاست میں یہ اکثریت کی زبان نہیں ہے، بہرحال جموں وکشمیر میں اسے ریاستی زبان اور آندھرا پردیش کے بعض علاقوں میں علاقائی زبان کا مرتبہ دیا گیا۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ ہدایت دی کہ جن ریاستوں میں اُردو کا چلن ہے وہاں اردو کی تعلیم اور علاقائی زبان کی حیثیت سے اُس کے استعمال کے لئے سہولتیں فراہم کی جائیں۔ دو مہینے بعد یونین حکومت کی وزارت داخلہ نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کی پالیسی کی روشنی میں اردو سے متعلق گورنمنٹ کے موقف کی وضاحت کی، لیکن عمل درآمد کا معاملہ ریاستوں کے ہاتھ میں ہے، پرائمری ایجوکیشن اور اس طرح کے دوسرے معاملات سے متعلق مرکز کو صدر کی ہدایات جاری کرنے کے مناسب اختیارات حاصل ہیں، لیکن باوجود اس کے کہ لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے اترپردیش میں اُردو کی حق تلفی کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے مرکزی حکومت اردو کے حق کے تحفظ کے سلسلہ میں ہمیشہ پہلو تہی کرتی رہی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف تناؤ کی ایک فضا قائم کرکے اردو بولنے والی اقلیتوں کے ساتھ لسانی ظلم وجبر کا سلسلہ جاری ہے۔ اترپردیش اور بہار میں جب اُردو والے ایجی ٹیشن کر رہے تھے کانگرس ورکنگ کمیٹی نے اردو کے مسئلہ پر غور کیا، ایک نامہ نگار نے لکھا کہ " اردو کو ثانوی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے یا نہ تسلیم کیا جائے، اس نزاع کے بارے میں کوئی واضح رائے دینے کے بجائے کمیٹی نے پھر وہی بات دہرائی کہ اُردو زبان کی مناسب حیثیت تسلیم کی جائے اور اس سلسلہ میں کانگرس کا رویہ لبرل ہونا چاہئے۔" (اسٹیٹسمین، دہلی ایڈیشن، ۲؍اگست ۱۹۶۷ء)۔ تین ہفتے بعد جب رانچی میں اردو مخالف مظاہرے بڑھ کر مسلمانوں

کے خلاف فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں رونما ہو رہے تھے، نئی دہلی کے ایک سیاسی نامہ نگار نے لکھا کہ
"۔۔ یہاں تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۵۸ء میں ملک کی اردو بولنے والی اقلیت کو جو ضمانتیں دی گئی تھیں ان میں سے زیادہ تر چھ متعلق ریاستوں یعنی آندھرا پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، میسور، راجستھان اور اتر پردیش نے پوری کر دی ہیں۔" (اسٹیٹسمین، دہلی ایڈیشن، ۲۷ اگست ۱۹۶۷ء) ۔معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت اس نہج پر سوچ رہی تھی کہ کہیں اور اردو کے لئے مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، حالانکہ صورت یہ تھی کہ صرف غیر ہندی ریاست آندھرا پردیش میں اردو کو سرکاری سطح پر تسلیم کیا گیا تھا جبکہ ہندی ریاستوں میں اس کی حالت بڑی زبون تھی ۔ اس نامہ نگار نے یہ بھی لکھا کہ "بہر حال، جہاں تک یو۔پی کا تعلق ہے اقلیت کے ترجمان یہ کہتے ہیں کہ اردو کی تعلیم کے لئے جو سہولتیں ہونی چاہئیں وہ دستیاب نہیں، لیکن ریاستی حکومت کا کہنا ہے کہ سہولتوں کے لئے کوئی مطالبہ نہیں، اس کا دعویٰ ہے کہ اردو بولنے والے بچے خود ہندی پڑھ رہے ہیں تاکہ وہ ریاست کی زندگی کے عام دھارے سے الگ ہو کر نہ رہ جائیں ۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر کو جو شکایتیں موصول ہوتی ہیں اُن میں بیشتر کا تعلق یو۔پی ہی سے ہے۔" (اسٹیٹسمین، ۲۷ اگست ۱۹۶۷ء)

آزادی کے بعد ہندی ریاستوں میں اردو پر جو کچھ گذری اور آج اکیس سال بعد بھی جو کچھ بیت رہی ہے اُس سے لوگ واقف ہیں، موہن رام صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو کے ساتھ غیر ہندی ریاستوں میں تو انصاف کیا گیا لیکن اس کے اپنے وطن میں اس پر ظلم کیا گیا، اُن کی یہ بات صحیح ہے اور اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، یہ ہے کہ اُردو جو ہندوستان کی مشترک تہذیب کی علامت ہے تنگ نظری اور فسطائی رجحان کا شکار ہو گئی، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اِسے ایک سیاسی مسئلہ بنا دیا گیا اور اسی وجہ سے جواہر لال نہرو جیسا روشن خیال اور سیکولر ذہن کا انسان بھی اِسے حل نہ کر سکا، اردو والے غیر ہندی ریاستوں کے ممنون ہیں لیکن موہن رام صاحب کی طرح کا انداز فکر رکھنے والوں کی طرف سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں جنوبی ہندوستان اپنی ہندی دشمنی کی رَو میں اُردو کے

مسئلہ کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال نہ کرے، اردو کے حامیوں کو اس سلسلے میں ہوشیار رہنا چاہئے۔

ہم نے پارلیمانی طرزِ حکومت کو اپنایا، جمہوریت ہمارا ایک بڑا آدرش ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جمہوری نظام کی کامیابی کے لئے قوم کے دل و دماغ کی جس طرح تربیت ہونی چاہئے اُسے یکسر نظر انداز کر دیا گیا، نتیجہ یہ ہے کہ آج ہماری ہیئت اجتماعی گہرے قسم کی اخلاقی پستی کا شکار ہو کر رہ گئی ہے، ہمارے سیاستداں موقع پرستی کو بڑی اہم سیاسی قدر تصور کرتے ہیں، حالانکہ جمہوری نظام کے استحکام کے لئے ضروری ہے کہ کسی قیمت پر سچائی، دھرم اور دیانتداری کو ترک نہ کیا جائے چاہے سیاسی اقتدار ہاتھ میں رہے یا نہ رہے، ہمیں یقین تو نہیں آتا لیکن ایسی باتیں تواتر کے ساتھ سننے میں آتی ہیں کہ محض اکثریت کے خوف سے اُردو زبان کو اِس کے جائز حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ اُتر پردیش میں ایسے معقول سیاستداں ہیں جو اُردو والوں کو اُن کی مادری زبان سے محروم کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن انھیں اس خوف میں مبتلا کر دیا گیا کہ اگر اُنھوں نے اُردو کے سلسلے میں انصاف اور معقولیت کا کوئی قدم اٹھایا تو پارٹی کو نقصان پہونچے گا۔ اور اس بات سے وہ ڈر گئے، اس طرح دونوں طرح کے سیاستدانوں نے "ستیہ اور دھرم" کو چھوڑ دیا، اور وہ کام کر بیٹھے کہ تاریخ انھیں کبھی معاف نہ کرے گی، فکر و عمل کی کجی کا بھی عجب معاملہ ہے، ایک بات میں اگر کجروی اختیار کر لی جائے تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جو قدم بھی اٹھتا ہے غلط اٹھتا ہے، آج ملک کو جس انتشار و درماندگی، تخریب کاری اور زبوں حالی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ فکر و عمل کی اسی کجی کا نتیجہ ہے۔

پروفیسر نیازی برکس
مترجم: ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی

ضیار گوکلپ
اور
ترک قومیت کی تشکیل

جدید ترکی کی تاریخ میں ضیار گوکلپ کا مرتبہ، ایک مفکر اور عالم کی حیثیت سے، بہت اونچا ہے،
کہتے ہیں کہ مصطفیٰ کمال کی انقلابی اصلاحات کے پیچھے بڑی حد تک اُس کے نظریات ہی کی کارفرمائی
تھی، رسالہ جامعہ کے ناظرین اس شخصیت سے واقف ہیں کیونکہ مارچ ۱۹۷۱ء اور جون ۱۹۷۴ء
کے شماروں میں اس کی زندگی اور خیالات سے متعلق میرے دو مضمون شائع ہو چکے ہیں، پروفیسر
نیازی برکس کا یہ مضمون ۱۹۵۴ء میں "مڈل ایسٹ جرنل" میں شائع ہوا تھا، ڈاکٹر محمود الحسن
صاحب نے اس مضمون کے ضروری حصوں کا آزاد ترجمہ کیا ہے جسے ہم شائع کر رہے ہیں،
پچھلے دس سال میں ترکی کے حالات میں بڑی تبدیلی ہو گئی ہے۔ سیکولرزم اب ترک عوام میں
مقبول نہیں معلوم ہوتا، لیکن ابھی ایسا بھی نہیں کہ اس کے خلاف کوئی علمی و فکری تحریک ہو تعلیم یافتہ
طبقہ اب بھی سیکولرزم کے اصولوں کا حامی ہے، ہاں اصلاحات کے نام پر کئی ایسی چیزیں جو قانون
اور ریاست کے جبر سے عوام پر لادی گئی تھیں، اُن کے خلاف شدید ردِ عمل ظاہر ہوا ہے حقیقت
یہ ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر ضیار گوکلپ کے نظریے کو مکمل طور پر نہ تو مصطفیٰ کمال نے عملی
شکل دی اور نہ ان کے بعد اُن کے ہم خیال ترک رہنماؤں نے اس کی کوشش کی۔ یہ بات بھی

غور طلب ہے کہ مغربی تمدن کو اپنا لینے کے بعد بھی ترک قوم جاپانیوں کی طرح ایک بڑی صنعتی طاقت کیوں نہ بن سکی؟

'مدیر'

ضیا گوکلپ بیسویں صدی کے ترک مصنفین میں سب سے زیادہ با اثر اور طباع مصنف کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اس کی موت پر ۴۳ سال گذر گئے مگر آج بھی اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا، اس کا انتقال ۲۵ر اکتوبر ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ اس نے اپنی تصانیف ۱۹۱۱ - ۱۹۱۸ اور ۱۹۲۲ - ۱۹۲۴ کے دوران مکمل کی ہیں پہلے دور میں اس نے تہذیبی تبدیلی کے بنیادی مسائل پر بحث و جستجو کی نئی راہ اپنائی۔ یہ تبدیلی ۱۹۰۸ء میں دستوری نظام کی بحالی کے بعد ترکی میں شدت اختیار کر چکی تھی، دوسرے دور میں وہ انھیں راستوں پر گامزن رہا حالانکہ اناطولیہ میں مصطفےٰ کمال کی زیر نگرانی قومی حکومت کے قیام سے اس کے خیالات کا بڑا حصہ عملی صورت اختیار کر چکا تھا۔

گوکلپ کی تصنیفات میں مرکزی موضوع یہ سوال تھا کہ ترکوں کو مغربی تمدن کس طرح اپنانا چاہیئے اور اس مغربی تمدن کو کس طرح ترکوں کی دو تاریخی روایات یعنی 'ترکیت' اور اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہیئے، دوسرے لفظوں میں ترک بحیثیت قوم اور اسلام بحیثیت مذہب جدید تمدن کے احوال میں کیا مقام متعین کریں۔ ظاہر ہے یہ مسائل نئے نہیں تھے، ضیا سے پہلے بھی اہل فکر نے ان کو چھیڑا اور اس پر غور و فکر کیا تھا۔ ضیا کی ندرت یہ ہے کہ اس نے ان سوالات پر باقاعدہ، ~~اور مربوط~~ اسکیم کے تحت بحث کی، اس کی تفصیلات و فروعات کا تجزیہ کیا، ان سے نتائج اخذ کئے اور بعد میں انھیں تہذیبی پالیسی کے لئے بطور لائحہ عمل کے پیش کیا۔

اس نے پہلے پہل یہ کام اس وقت شروع کیا جب مملکت عثمانی تکلیف دہ حد تک زوال پذیر تھی اس وقت نئے قومی نظام کا ارتقاء کسی قدر مبہم مرحلہ میں تھا، بلاشبہ ان دونوں احوال نے ضیا کے کام کو صوری و معنوی خوبیوں و خامیوں کی حیثیت سے متاثر کیا۔ بہرحال پہلی جنگ عظیم میں شکست کے بعد مملکت عثمانی کے زوال نے اس کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں سازگار ماحول تیار کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اتاترک کی انتہا پسندانہ

اصلاحات کے ابتدائی دور میں اس کا انتقال ہوچکا تھا تاہم ان اصلاحات کے پیچھے جو خیالات کارفرما ہیں وہ ضیا کی تصنیفات میں نظر آئیں گے۔ جہاں تک اس کی اسلامی اصلاحات کی تفصیلات کا تعلق ہے اس کے خیالات کو شدید لامذہبیت کے آخری دور میں سخت صدمہ پہنچا۔ پھر بھی میرا یقین ہے کہ اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو اتاترک کی پالیسی سے ہم آہنگ ہونے کے قابل ہوجاتا، مزید برآں ہم کو معلوم ہے کہ سیکولرزم ضمیر کی آزادی اور فکر کی آزادی سے متعلق دستوری دفعات اس کے قلم کی مرہون منت ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کمیٹی کا ممبر تھا جس نے ۱۹۲۴ء میں نیا دستور تیار کیا تھا، شاید ضیا کے لئے اتاترک کی بے میل لسانی پالیسی سے متفق ہونا مشکل ترین مسئلہ ہوتا۔ تاہم وہ ترک جمہوریہ کے بنیادی رجحانات مثلاً مغربیت، جمہوریت، سیاسی، معاشی اور قومی آزادی اور لامذہبیت کو منضبط کرنے والا لائق ترین فرد ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے مباحث کے کچھ حصے سے انحراف کیا جاتا رہا ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ بنیادی مسائل سے متعلق آج بھی اسی کا طرز فکر ہے جو ترکی کی جدید اصلاحات کے پیچھے عقلی قوت بن چکا ہے۔

ضیا کے افکار کے عملی پہلو اور پہلی جنگ عظیم سے قبل اور بعد کے برسوں میں ان خیالات کے سیاسی عمل سے قریبی ربط کی بنا پر چند نقادوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ترکی کی بدنصیبیوں کا ذمہ دار ضیا ہی ہے۔ لیکن اس نظریاتی ربط کے باوجود ضیاء ہمیشہ سیاست سے الگ تھلگ رہا اور بحیثیت استاد اور مصنف کے زندگی گذاری۔ اس نے حکومت میں ذمہ داری کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا اور نہ کبھی سیاسی یا ذاتی مفاد کو اپنا مقصد حیات بنایا۔ اس نے تقریباً تنہائی کی زندگی گذاری کیونکہ وہ صاحب کردار غازی کی صفات سے محروم تھا۔ وہ بے انتہا شرمیلا اور مطالعہ باطن کا عادی تھا۔ اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو وہ ترک نوجوانوں پر غیر معمولی ساحرانہ اثر رکھتا تھا اور دوسری طرف مجلس اتحاد و ترقی کے سیاست داں بھی اس سے متاثر تھے۔ اُس کو ہم اِس طرز کا دانشمند کہہ سکتے ہیں جو سرزمین مشرق سے اٹھتے رہے ہیں۔ اس کے یہاں نمایاں طور پر صوفیانہ میلانات ملتے ہیں اسی لئے تصوف اس کی فکر میں ہمیشہ اہم رول ادا کرتا رہا ہے۔

یہی خصوصیت آج اس کے مقام کے تعین میں تضاد کی صورت پیدا کرتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اتنی موثر شخصیت اور اپنے متاثرین کا اتنا بڑا حلقہ رکھنے کے باوجود اس کی تصنیفات چند منتشر مضامین کے علاوہ بہت حد تک غیر معروف اور قارئین کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ چند نعرے اور وقتی طور پر متاثر کرنے والے جملے جنھیں اس نے مقبول عوام بنا دیا تھا لوگوں کے ہونٹوں پر اور حافظوں میں محفوظ رہ گئے۔ اس کے خیالات کا خاصہ حصہ مکمل طور پر فراموش کر دیا گیا یا انھیں توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور جن خیالات کو ضیا نے اپنی زندگی ہی میں رد کر دیا تھا وہ اس کی جانب منسوب کئے جاتے رہے۔ سوشلسٹ، انتہا پسند نسل پرست، مغرب پرست اور آزاد خیال سب نے اس پر مختلف طریقوں سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے "Solidarism"[۱] یا "Syndicalism"[۲] اور خلافت کے مثالی تصور کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ اس کی تحریروں کا ایک حصہ رومن رسم خط میں بار بار شائع ہوا ہے، لیکن اس کا کوئی مکمل اڈیشن اب تک نہیں چھپا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کی تصنیفات کی کوئی قابل اعتماد اور جامع فہرست بھی نہیں پائی جاتی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں، ایک سبب رسم الخط کی تبدیلی بھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اسباب ہیں جن کی اہمیت ہے شاید ان میں سے ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اس کی بیشتر تحریریں رسالوں میں شائع ہوئیں، مثلاً روزناموں کے اندر مختصر مضامین کی صورت میں انھیں جگہ ملی۔ وہ چند کتابیں بھی (ایک یا دو کو چھوڑ کر) جو اس کی زندگی میں چھاپی گئیں مضامین کا مجموعہ تھیں۔ وہ رسالے اور اخبارات جن کے لئے وہ لکھتا تھا ان میں کئی ایسے ہیں جو آج آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ بہت مختصر عرصہ تک جاری رہے، ان کی صرف چند کاپیاں موجود ہیں۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ گوکلپ کی تصنیفی زندگی کا سرگرم ترین دور اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جو ترکی کی تاریخ کا نازک ترین اور غیر مستحکم دور شمار کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے دور میں غور و فکر کے ساتھ مفصل کتاب لکھنا مشکل ہوتا ہے، اسی بنا پر جیسا کہ اس نے خود اعتراف کیا

۱۔ مفاد میں اشتراک و یکسانیت۔

۲۔ فرانسیسی مزدوروں کی تنظیم جس کا مقصد ذرائع پیداوار کو مزدوروں کی انجمن کے ہاتھوں میں دینا ہے۔

ہے اسے اپنے وسیع مطالعہ کو کتابی شکل میں منضبط کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا کہ وہ اپنے تاریخی، عمرانی اور فلسفیانہ خیالات کو تفصیل سے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے، اور آخری سبب اس دور کی وہ سماجی ونفسیاتی حقیقت ہے جسے اس سلسلہ میں ذہن میں رکھنا چاہئے، سماجی انقلاب، تیز رَوی اور پراگندگی کے زمانے میں وہ خیالات جو عوام کے لئے کشش رکھتے ہیں افسانوں میں بدل جاتے ہیں، ایسی صورت میں عوام ان امتیازات کو جو ایک مفکر اپنے تصورات کے مجموعی ڈھانچہ میں قائم کرتا ہے ادراک نہیں کر پاتے۔ وہ اصطلاحات کی جو متعین اور جچی تلی تعریف کرتا ہے ان تک نگاہیں نہیں پہنچتیں اس لئے وہ لکیر کے فقیر ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آج بھی تہذیب و تمدن کے درمیان ضیا گوک آلپ نے جو فرق قائم کیا ہے اس کو لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں اور ایک سمجھ دار آدمی کو حیرت ہوتی ہے جب مغربی قوم پرستی کے مخالف نظریہ یا نسل پرستی اور نسلی قومیت کا اصول اس کی تحریروں سے اخذ کیا جائے۔

ایسے اہم اور بڑے مسائل جنھیں گوک آلپ نے چھیڑا ہے وہ انیسویں صدی کے نصف اول میں رونما ہو چکے تھے۔ یہ دور ترکی کی تاریخ میں دورِ تنظیمات کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسائل بالخصوص اس وقت پیدا ہوئے جب دولت عثمانیہ کے سیاسی، قانونی اور انتظامی ڈھانچہ کو ازسرِ نو منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ ترکی پہلے ہی مغربی اثر کے تحت آچکا تھا، مزاحمت کے باوجود اٹھارھویں صدی میں مغربی تمدن کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے مسلسل واضح آثار نظر آنے لگے تھے لیکن یہ محض آثار تھے، سیاسی، سماجی اور تہذیبی وفکری زندگی میں کوئی حقیقی تبدیلی ابھی نہیں ہوئی تھی، اور یہ بات حیرت کی ہے کہ ترکی میں اٹھارویں صدی میں پریس جیسی انقلاب آفریں شئے کے باوجود ذہنی وفکری زندگی پر اب بھی 'مدرسہ سسٹم' کا طرزِ فکر چھایا ہوا تھا، اسی طرح ادب اور آرٹ پر بھی روایت پرستی کا غلبہ تھا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں بے اطمینانی کے اس احساس نے جو اٹھارھویں صدی ہی میں ظاہر ہو گئے تھے مغربی اصولوں کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔ پہلا انقلابی قدم یہ اٹھایا گیا کہ جنیسری کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھنے لگی۔ یہ نظام ایک خاص قسم کی

سپاہیانہ جاگیرداری کی جگہ لے رہا تھا۔ عثمانی تاریخ میں پہلی بار ایک اہم ادارہ کو تباہ کرکے اس کی جگہ دوسرے نظام کو لانا ضروری ہو گیا تھا۔ یہ کام روس میں کسی حد تک ایک صدی پیشتر پیٹر اعظم کی اصلاحات کے مشابہ تھا۔ ۱۸۵۶ـــ ۱۸۳۹ کے دوران تنظیمات کے فرامین دراصل اس تحریک کی سرکاری طور پر توثیق کرتے تھے۔ یہیں سے یہ حقیقت بطور طے شدہ پالیسی کے تسلیم کرلی گئی کہ ان پرانے اداروں کو جو جدید اداروں سے ہم آہنگ اور موافق نہیں ہوتے انھیں ختم کردیا جائے اور نئے ادارے مغربی نمونوں پر قائم کئے جائیں۔ لیکن اس راہ میں متوازن اور ہم آہنگ طور پر آگے بڑھنے میں دو رکاوٹیں تھیں۔ ایک یہ کہ اسٹیٹ اور حکومت کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی کی جائے یعنی مستبد اور مطلق العنان عثمانی سلطنت اپنے آپ کو جمہوری سانچے میں ڈھالے۔ دوسری رکاوٹ عہد وسطی کے معاشی اور سماجی ادارے تھے، یہ ادارے کسی طرح مغرب کی پھیلتی ہوئی معاشیات کے جدید اصولوں اور نئے اداروں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ یہی دو بڑے سبب ہیں جن کی بنا پر تنظیماتی رہناؤں کو تجدد کے عمل کو جاری رکھنے میں ناکامی ہوئی۔ تنظیمات کے رہنا چند چیزوں میں تو تجدّد چاہتے تھے اور باقی چیزوں کو جوں کا توں رکھنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس دوعملی کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ مغرب کی نقالی کی جائے اور اپنی اسکیموں کو تضاد کا شکار ہونے دیا جائے۔ اور وہی ہوا یعنی زندگی کے تقریباً ہر میدان میں "ثنویت" کا ایک سلسلہ پیدا ہو گیا۔ سیاست، انتظامیہ، قانونی نظام، تعلیم اور ذہنی زندگی کے میدانوں میں دو طرح کے ادارے، دو وضع کے تصورات اور دو قسم کی وفاداریاں ایک پرانے نظام کے ساتھ اور دوسری جدید نظام سے پہلو بہ پہلو وجود میں آتی گئیں۔

نامق کمال (۱۸۸۸ـــ ۱۸۴۰) نے اِس مریضانہ کیفیت کی تشخیص کی اور اس کو جدید اسٹیٹ کے قیام کی راہ میں اہم ترین رکاوٹ قرار دیا۔ اس نے اسلام کے مذہبی، اخلاقی اور قانونی اداروں کی مثالی اور حقیقی صورت دکھانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی خالص عثمانی اداروں کا حقیقی روپ نکھارنے کی جد وجہد کی اور مغربی تمدّن کے ان پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا جن کی وجہ سے مغربی اقوام ترقی، خوشحالی اور سربلندی سے ہمکنار ہوئیں۔ ان تینوں عناصر پر بحث کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کے مابین

بنیادی اختلافات نہیں پائے جاتے۔ اس کا خیال تھا کہ اسلام سماج کے لئے اخلاقی اور قانونی بنیادیں فراہم کرے گا، جہانبانی کی عثمانی روایات اپنی کثیر القومی اور کثیر المذہبی خصوصیات رواداری اور وسیع المشربی کی پالیسی کے ذریعہ عثمانی مملکت کا سیاسی نقشہ تیار کریں گی اور مغربی تمدن اس نظام کے لئے مادی اور عملی ضابطہ تکنیک مہیا کرے گا تاکہ ترکی جدید دور کی طاقت اور معاشی ترقی کی دنیا میں زندہ رہنے کے قابل ہوسکے۔ اس طرح نامق کمال نے ترکوں کی انیسویں صدی کی زندگی میں ان تینوں عناصر کے دائرۂ عمل کو متعین کیا۔ اس کے خیال میں تنظیمات کی ناکامی کا اہم سبب وہ انتشار تھا جو ان تینوں عناصر کے بارے میں رہناؤں کے دماغ پر مسلط ہوگیا تھا۔ مثال کے طور پر انھوں نے فرانس کے مجموعۂ قوانین کو اپنانے کی غرض سے شریعت کو چھوڑ دیا، حالانکہ تعلیم، حکومت، سائنس، معاشیات اور زراعت میں مغرب کے اصولوں کو رواج نہیں دیا گیا۔ مملکت کو جدید بنانے کے لئے تنظیماتی لیڈروں نے غیر ضروری حد تک اُن مغربی طاقتوں کے معاشی اور سیاسی بوجھ کو قبول کیا جنھوں نے دولت عثمانیہ کی علاقائی سالمیت اور آزادی پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ انھوں نے اپنے نظام میں جدید جمہوری نظام حکومت کے کسی اصول کو بھی نہیں برتا۔ حالانکہ قدیم عثمانی سیاسی ادارے اور اسلامی قوانین جمہوریت اور جدید سائنس کے مخالف نہ تھے۔ دوسری طرف یہ بات بھی تھی کہ مغرب کے سامراجی نظام کی سازشوں کے سبب اس کی فرصت بھی نہیں ملی کہ امن وسلامتی کی فضا میں ان تینوں عناصر میں ہم آہنگی کا موقع ملتا۔

پہلے تو واقعات کی رفتار نامق کمال کے تصورات سے مختلف تھی اور ان افکار کو سختی سے دبا دیا گیا مگر ۱۹۰۸ء میں دستوری انقلاب کے بعد ان کو سازگار ماحول ملا، لیکن اس ماحول کو وہ تین نظریاتی تحریکیں بھی ورثہ میں ملیں جو سلطان عبد الحمید کے عہد میں ظاہر ہوئی تھیں لیکن اس کے استبداد کے سبب ان میں سے دو کو برگ وبار لانے کا موقع نہ ملا تھا ان میں ایک تھی 'اسلامیت' جو پین اسلامزم کی حامی تھی اور اسلام پر مغربی مصنفین کی تنقید کے مقابلہ مدافعانہ طرز فکر بھی رکھتی تھی، دوسرا عنصر 'مغربیت' کا تھا۔ اس کے پرستاروں میں لامذہبوں کی تعداد زیادہ تھی جس میں نئے سیکولر تعلیمی اداروں کی بنا پر روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کے علاوہ ایک اور چھوٹی سی جماعت وجود میں

آئی جو 'ترکیت' کے تصور کی حامل تھی۔ اس کے حامی روسی حکومت کے تحت ترکی زبان بولنے والے عوام کی سیاسی، معاشی اور ادبی بیداری سے سرشار تھے، اِن پر ان مغربی ادیبوں کا بھی اثر تھا جو رومانیت سے مخمور تھے، انھوں نے نامق کمال کے استاد شناسی کی تحریک سے بھی کسب فیض کیا تھا جس کی خصوصیت ترکی زبان ثانی سے دلچسپی تھی۔ مملکت عثمانی کی غیر مسلم اور ترک جماعتوں کی قوم پرستانہ تحریکوں نے بھی ان کو متاثر کیا تھا، اور ساتھ ہی پین سلاو ازم اور پین جرمن ازم جیسی فکری و سیاسی تحریکوں کا اثر بھی ان کے خیالات پر پڑا۔

بہرحال اسلام پسندوں، مغرب پرستوں اور ترکیت کے حامیوں میں جو چیز قدر مشترک کے طور پر تھی۔ وہ 'عثمانیت' تھی، کوئی گروہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ عثمانی سلطنت جس میں مختلف مذہب، زبان اور نسل کے لوگ شامل تھے، ختم ہو جائے، لیکن رفتہ رفتہ یوسف اکورا کی پین تورانی تحریک کا اثر نوجوان ترکوں میں نفوذ کر گیا اور ۱۹۰۸ء کے انقلاب سے پہلے جو ذہنی انتشار تھا اس میں کاکیشیا کے ڈاکٹر حسین زادہ علی کے اِس پیرو کی آواز ہی واضح اور پُر اثر تھی، اس نے سیاسی سطح پر وضاحت سے اپنے خیال پیش کئے اور یہ بتایا کہ اسی میں عثمانیت کی بقا اور ترکوں کا فائدہ ہے۔ انجمن اتحاد و ترقی کی میٹنگوں میں جو بحثیں ہوتی تھیں، ان میں ہر طرح کی آواز سنائی دیتی تھی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پین تورانی نظریہ زیادہ مقبول تھا۔

ضیا گوکلپ ایک چھوٹے سے شہر کا نوجوان طالب علم تھا، وہ عینیت کا قائل اور گہرے وطن پرستانہ جذبات سے سرشار تھا۔ اسے نہ تو استنبول کے ترک عالموں سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا اور نہ ہی پان تورانی خیالات کے حامل اشخاص سے۔ جب وہ ۱۸۹۶ء میں دیار بکر سے استنبول آیا تو وہاں عثمانیت، پان اسلام ازم اور پان ترک ازم جیسے نظریات تعلیم یافتہ طبقہ میں موضوع بحث بنے ہوئے تھے۔ گوکلپ کی شاعری میں نامق کمال جیسے تخیل پرست اور اسلام پسند اور توفیق فکرت جیسے مغرب پرست اور الشان دوست صوفی کے اثرات اس کی علامت ہیں کہ وہ مذکورہ تینوں رجحانات سے متعلق تذبذب میں مبتلا تھا، اس کے مزاج، اس کی تعلیم اور دیار بکر کی قصباتی فضا نے

تصوف، دینیات اور سائنس تینوں سمتوں میں اس کے خیالات کے لئے نئی جولانگاہیں فراہم کیں، ان تینوں کی بظاہر آویزش نے اُسے برسوں الجھاوے میں رکھا لیکن رفتہ رفتہ عقلیت اُس کے یہاں اجاگر ہوتی گئی، اور یہی عقلیت ترک تہذیب، اسلام اور جدید تمدن سے متعلق اس کے افکار کا طرۂ امتیاز ہے۔

دستوری انقلاب (۱۹۰۸ء) کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ضیا گوکلپ بڑی تیزی سے مشہور ہوا۔ اس وقت وہ سالونیکا میں تھا۔ جہاں ۱۹۰۵ء سے پہلے اس کا تعلق انجمن اتحاد و ترقی سے ہو گیا تھا۔ اس انجمن سے وابستہ ذہین نوجوانوں کا وہ طبقہ تھا جو نئی زندگی کا مشتاق تھا مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ نئی زندگی کیسی ہوگی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور اس کی عملی تعبیر کیسی ہوگی۔ یہ ایسا وقت تھا جب ترکی کو نہ صرف یہ کہ معاشی دیوالیہ پن، استبداد اور فساد و انتشار سے نکلنے کے لئے بے انتہا جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی، بلکہ اخلاقی اور عقلی انتشار سے نجات حاصل کرنے کی فکر تھی۔ ترکی کے دانشور ترکی کی تعمیر نو چاہتے تھے اور ایک طرح کی شدید حب الوطنی جو غیر مسلم اور غیر ترک جماعتوں کی قوم پرستی کی تحریکوں کا ردعمل تھی، انہیں اس تعمیر نو کے لئے بے چین کئے ہوئے تھی۔

ضیاء کی بصیرت نے یہ سمجھ لیا تھا کہ محض سیاسی تبدیلی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا جب تک اس کی اساس سماجی اور تہذیبی انقلاب پر نہ ہو۔ لیکن ترکی کے دانشوروں، خاص طور سے سیاستدانوں کو وقت کے ہنگاموں میں اس کا اتنا احساس نہ تھا۔ جو لوگ قدامت پرست تھے انقلاب کے بعد انھوں نے جرأت سے شریعت اسلامی کی جانب رجوع کرنے پر زور دیا، دوسرا طبقہ آزاد خیالوں کا تھا جو مغربی تہذیب و تمدن کو جوں کا توں اپنانے پر تلے ہوئے تھے، ترکیت کے علمبردار ترکوں کے نسلی اتحاد کا نعرہ لگا رہے تھے اور ترکوں کی اسلامی دور کی تاریخ سے قبل کے زمانے کی طرف لوٹ جانے کی تبلیغ کر رہے تھے وہ پورے طور پر رومانیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ضیاء گوکلپ کو ہر تصور میں کچھ نہ کچھ سچائی نظر آئی لیکن وہ کسی ایک تصور سے مکمل طور پر متفق نہیں ہوا۔ اس نے کسی قدر نامق کمال کے نقطۂ نظر کی پیروی کی یعنی مغرب کے محض مادی تمدن کو اپنانا اور اس کے غیر مادی پہلوؤں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ لیکن نامق کو اس عقیدہ کی خاطر بہت بھاری

قیمت ادا کرنی پڑی تھی کیونکہ وہ جدید تمدن کے تقاضوں اور ترکی کے روایاتی اداروں کے باہمی تضاد کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکا تھا۔ بہر حال ضیا گوکلپ نامق اور دوسرے تنظیماتی مفکرین کی طرح مجرد عقلیت پرستی کا پرستار نہیں تھا، یہ عقلیت مغرب کی اٹھارویں صدی کے عقلیت پرستوں سے مستعار لی گئی تھی اور جو آگے چل کر انیسویں صدی کے رومانی فکر سے متاثر ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسلام پسندوں اور مغرب پرستوں دونوں کے نظریات کی بنیاد انفرادی تعقل پر ہے اور فرد کا تعقل سماجی تشکیل نو کے لئے معیار نہیں بن سکتا کیونکہ وہ یا تو قدامت کی طرف لے جائے گا یا پھر تصوریت کی تبلیغ کرے گا، اس طرح دونوں صورتوں میں حقائق سے چشم پوشی ہو گی۔ سماج کی جدید تعمیر کا کام افراد کے تعقل کے بجائے سماجی تعقل سے شروع ہو گا۔ ایک مردہ ادارہ کو نہ تو کوئی شخص اپنی خواہش کی بنا پر زندہ ہی کر سکتا ہے اور نہ اس کے اندر یورپ کی نقالی کر کے زندگی کی روح پھونک سکتا ہے، اس کا عقیدہ تھا کہ عوام یا قوم ہی اس بات کا آخری اور صحیح معیار ہے کہ کونسی چیز پسندیدہ ہے اور کونسی ناپسندیدہ، کس چیز کو قبول کرنا چاہیئے اور کسے ترک۔ عوام کا اجتماعی ضمیر جس چیز کو قبول کرلے وہ معیاری اور مثالی ہے اور جسے رد کر دے وہ غیر معیاری۔ ضیا نے اس بات پر زور دیا کہ وقت کی اہم اور فوری ضرورت یہ ہے کہ ترک بحیثیت قوم بیدار ہوں اور اپنے آپ کو جدید تمدن کے احوال وعوامل سے ہم آہنگ کریں اور اس طرح اُس نے پین ترکیت کے سیاسی فکر کو ایک تہذیبی شکل دی۔ چونکہ عمرانیات پر اس کا عقیدہ ایک ثبوتی فلسفہ کی حیثیت سے تھا اِس لئے اس کا خیال تھا کہ اِس علم کی مدد سے پہلے یہ فیصلہ کیا جائے کہ ترک قوم پہلے ہی سے کس چیز کی مالک اور کس چیز سے محروم ہے۔

گوکلپ نے اس مسئلہ کی چھان بین اس حقیقت کے اعتراف سے شروع کی کہ ترکی تہذیبی اعتبار سے مریض ہے۔ اس کی یہ تشخیص تھی کہ ترکی کے سماج کے ہر شعبہ میں ثنویت پیدا ہو چکی ہے۔ ایک طرف تو عوام اپنے حقیقی اور غیر رسمی اداروں، اپنے مذہب، اپنے فن اور اپنے فکر کے ساتھ وابستگی رکھتے تھے اور دوسری طرف سرکاری تنظیم اپنے رسمی اور مصنوعی اداروں کے ساتھ تھی جنھیں اس نے کلیتۃً مغربی اور مشرقی تمدن سے مستعار لیا تھا، اس کا قانون، اس کا درباری ادب، اس کی

ناقابل فہم زبان اور فرانسیسی تمدن کی سطحی نقالیاں سب کی سب اس کے ساتھ تھیں اور ان میں سے کسی کا تعلق ترک عوام کی زبان و تہذیب سے نہ تھا۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ دونوں ایک دوسرے سے اجنبی رہے بلکہ ان میں بُعد المشرقین پیدا ہوگیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ گوکلپ کی رائے میں اس غیر فطری حالت کی وجہ سماجی زندگی کے دو ضروری اور ممتاز پہلوؤں یعنی تہذیب اور تمدّن کے درمیان تطبیق کی کمی تھی۔ تہذیب اور تمدن کے مباحث کی اس کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔ اگرچہ ان مباحث نے گوکلپ کے نقادوں کو اس الجھن میں مبتلا کر دیا کہ دونوں چیزوں یعنی تہذیب اور تمدّن کے درمیان امتیاز کی حد کہاں ہے لیکن اگر اس کے تجزیوں کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو یہ دونوں تصورات متناقض اور ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ نہیں بلکہ وہ سماجی حقیقت کے دو ایسے اوصاف ظاہر کرتے ہیں جو ایک دوسرے کی تکمیل میں تعاون کرتے اور گہرا ربط رکھتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ تمدن عمل کے اس طور طریقے کو کہتے ہیں جو ایسی روایات سے مرکب ہوتا ہے جن کو مختلف نسلی جماعتوں نے پیدا کیا اور ایک دوسرے تک منتقل کیا۔ دوسری طرف تہذیب ایک مخصوص قوم کے "Mores" سے مرکب ہے لہذا ممتاز بھی ہے۔ روایات طرزِ عمل کی ایسی عقلی ہیئتیں ہیں جسے افراد کے مشترک تمدن نے ان پر عائد کیا ہو مگر "Mores" کسی قوم کی روح اور مخصوص مزاج کو ظاہر کرتے ہیں۔ تہذیب ایک نظام کو تشکیل دیتی ہے جس کے عناصر مخصوص منطقی بنیادیں کلی ربط باہمی رکھتے ہیں، اس کے برعکس تمدن کا اس قسم کی کسی منطق سے تعلق نہیں ہوتا۔ تمدنی عناصر انسانوں کی زندگی میں اس وقت بامعنی اور باعمل ہوتے ہیں —— جب ان سے تہذیب کی خدمت ہوتی ہے۔ تمدن بغیر تہذیبی بنیاد کے محض مشینی نقالی بن کر رہ جاتا ہے وہ نہ تو کبھی انسانوں کی زندگی کی گہرائیوں میں سرایت کرتا اور نہ کبھی بار آور ہوتا ہے۔ بالکل یہی سانحہ ترکی کو پیش آیا اور غالبًا دوسری مسلم اقوام کو بھی جہاں تمدن ایک کھوکھلا ڈھانچہ ہو کر رہ گیا تھا اور سماجی جسم کے تمام تہذیبی گوشت وخون کو دیمک لگ گیا تھا چنانچہ جب مغرب کا نیا تمدن سامنے آیا تو یہ بے جان ڈھانچہ اپنی تمام معنویت اور تخلیقی صلاحیت کھو بیٹھا۔ مغربی تمدن کے اثر کے ساتھ اس صورت حال نے سوچنے والوں کے دماغوں کو سہ گونہ دشواری میں مبتلا کر دیا مگر بنیادی طور پر مسئلہ یہی تھا یعنی تہذیب و تمدن کی دوئی کا۔

گوکلپ کے خیال میں اس دشواری کا حل بنیادی سماجی وحدت کی دریافت میں ہے، وہ وحدت جس سے تہذیبی اقدار کا سرچشمہ پھوٹتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق وہ سرچشمہ سوسائٹی کا پیکر ہے جس کو وہ قوم کا نام دیتا ہے۔ مزید برآں اس کا یقین تھا کہ قوم وہ آزاد سماجی اکائی ہے جس کی بنیاد جدید مغربی تمدن پر ہے، دوسرے لفظوں میں جدید مغربی تمدن کثیر انسانی جماعتوں کا بین الاقوامی عمل ہے۔ یہ انسانی جماعتیں سماجی ارتقاء کے مراحل سے گذر کر قومیت کی منزل تک پہنچتی ہیں۔ اس وقت ترکی اضطراب کے دور میں تھا کیونکہ تبدیلی سے گذر رہا تھا۔ یہ تبدیلی دینی تمدن سے ایسے تمدن کی جانب ہو رہی تھی جس کی بنیاد جدید قومیت کے تصور پر تھی اور جس کی پوری ماہیت اب تک نامعلوم تھی۔ ان نکات کو ثابت کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ قوم کی عمرانی حقیقت کو سماجی ارتقاء کی اصطلاح سے متعین کرے، اس کی تاریخی تشکیل کا سراغ لگائے، اس کے عناصر کا تجزیہ کرے اور بالآخر تہذیبی تنقید کا ایک اصول اس نظریے سے اخذ کرے تاکہ عدم مطابقت کے اسباب اور اسے دور کرنے کے ذرائع معلوم ہوں۔

ضیا گوکلپ کے افکار کا محور ترک قوم تھی' ملت' کا لفظ جو اب قوم کے معنی میں مستعمل ہے اس وقت سیدھے سادے مذہبی برادری کے مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ نامق کمال جس نے پہلی بار ترک عوام کے قومی شعور کو بیدار کیا۔ وہ بھی اپنے مثالی اسلامی معاشرے کے تصور میں جدید تمدن کے خاکے میں غیر حقیقی تصور پوری طرح نہ سمجھ سکا۔ گوکلپ نے عمرانیات کے اصولوں کے سہارے پہلی بار اس کی نئی تعریف پیش کی۔ اس نے قومیت کے مذہبی تصور کی دھجیاں اڑانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی، اس کی زندگی کا یہ مشن تھا کہ عام ترکوں پر یہ واضح کر دے کہ "عثمانی قوم" دو عمرانی حقیقتوں کا ملغوبہ ہے۔ پہلی حقیقت امت کا وہ مفہوم ہے جو بین الاقوامی مذہبی برادری سے عبارت ہے اور دوسری حقیقت وہ سیاسی نظام جو متعدد مذہبی برادریوں اور قومیتوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ گوکلپ نے اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا کہ مغربیت اور پان ترکیت کے فروغ کے ساتھ قوم کو دوسرے دو مزید تصورات سے ملا دیا گیا ہے اور یہ ہیں نسل اور بین الاقوامی تمدن کے تصورات۔ قوم کی شناخت ان میں سے کسی تصور کے وسیلے سے نہیں کی جاسکتی۔

گوکلپ کا خیال ہے کہ سماجی عمل کا مشاہدہ محض قوموں کے تاریخی ارتقاء کے اندر ممکن ہے جو تاریخ کے مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی جدید مغربی تمدن تک پہنچی ہیں۔ اس ارتقائی عمل کے دوران ہر سوسائٹی اپنی ایک مخصوص تہذیب کو نشوونما دیتی ہے۔ انسانی سماج کی ارتقائی رفتار مسلسل نہیں ہوتی ہے، اس کو متعدد انواع میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک ہی نوع کے سماجوں میں باہمی مشابہت، حقیقی رابطہ اور باہمی اعتماد، سماج کے اندر ذیلی سماج (حلقہائے تمدن) کی تشکیل میں ممد ہوتے ہیں، لیکن گوکلپ کے نزدیک وہ سماج کی برادریاں ہوتی ہیں۔ عمرانی نقطۂ نظر سے روابط رہتے ہیں کیونکہ ان میں تہذیبی اقدار کے مشترک بندھن نہیں ہوتے، محض تمدنی اتحاد کے رشتے ان کو ملائے رکھتے ہیں، حالانکہ اس کے برخلاف سوسائٹی یا قومیں زندگی کے مخصوص رخ اور ممتاز خلقی ارتقاء کی حامل ہوتی ہیں۔

جدید قوم اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئے طرز کی ہے۔ قوم کی تشکیل میں بنیادی عنصر نہ تو نسل ہے، نہ نسلی اتحاد، نہ دوسری قوموں کے ساتھ سیاسی یا مذہبی بنیاد پر بین الاقوامیت کا تصور اور نہ کسی تمدنی حلقہ کے اندر بقائے باہم کا خیال، جدید قوم ایک طرف تو تہذیبی اقدار کی عجیب پیچیدہ خصوصیات کی حامل برادری ہے اور دوسری طرف ایسا سماج جو خلقی احساس و عمل کے اتحاد، محنت کی تقسیم اور باضابطہ تقسیم کار پر مبنی ہے۔ نسلی افتراق پر مبنی معاشرے جو جدید اقوام کے روپ میں نمایاں ہوئے ہیں وہ ایک طرح کے بین الاقوامی سیاسی۔ مذہبی تمدنوں کے تحت دور اسیری سے گذر رہے ہیں اور جب ان تمدنوں میں انتشار پیدا ہوا تو اس کے نتیجہ میں بالکل ایک نئی صورت کے ساتھ منظر عام پر آئے ہیں۔ ان پر لادینیت اور جمہوریت کے ارتقائی عمل کی چھاپ بھی ہے۔ قومیں یوں ہی وجود میں نہیں آتیں، قوموں کے لئے نسلی بنیاد ضروری ہے انقلاب و تغیر کے تیز سیلاب سے گذرنا لازمی ہے اور ان کے لئے عظیم واقعات کے تحت قومی شعور کی تجدید کا تجربہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ قومیں نشأۃ ثانیہ کے وقت اپنے نسلی ماضی کی طرف دیکھتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اسی نسل کا سلسلہ ہیں، مگر زیادہ دنوں تک ایک ہی نسلی اکائی نہیں رہتی اور نہ وہ فرسودہ احوال کی جانب لوٹ سکتی ہے۔ ایک جدید قوم اپنے دینی یا شاہانہ تمدن کے ناخوشگوار نشہ کو زیادہ دنوں تک باقی نہیں رکھ سکتی۔ آج قوم متعدد نسلی اور مذہبی عناصر کی ایک ہیئت ترکیبی ہے جنھیں تاریخ

کے عمل نے باہم دگر مربوط کر دیا ہے۔ قوم کی اس نئی شکل میں قبائلی یا دینی تمدن کے عناصر کا ناخوشگوار نشہ اب مریضانہ کیفیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کے صرف وہ حصے نارمل ہیں جو تہذیبی ہیں، یہی حصے زندہ ہیں اور قومی اور قومی زندگی کو صحیح رخ پر ڈال سکتے ہیں۔

ضیا گوکلپ قوم کو ایک تہذیبی اکائی مانتا ہے لیکن وہ اس دشواری کا احساس بھی رکھتا ہے جب قومیں ایک تمدن سے نکل کر دوسرے تمدن میں داخل ہوتی ہیں، ترکی کے سامنے اس وقت یہی مسئلہ تھا۔ جدید تمدن کی حامل قوموں کا تہذیبی ورثہ ترک قوم کے تہذیبی ورثے سے بالکل مختلف تھا، اس لئے ترکی کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ تھا، ترک نہ تو ترکیت سے دستبردار ہو سکتے تھے کہ یہی ان کے اتحاد کا بنیادی پتھر تھا، وہ اپنے مذہب کو بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے کیونکہ وہ ان کی تہذیب میں رچ بس گیا تھا۔ ترکی کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی تہذیب کے ان بنیادی عناصر کو مغربی تمدن سے کس طرح ہم آہنگ کرے، گوکلپ اسی مسئلہ کو حل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نے عمرانیات کی ایک شاخ کا خاکہ مرتب کیا جس کو ہم تہذیبی عمرانیات کہہ سکتے ہیں۔ تہذیبی عمرانیات کے اصولوں کو منطبق کرکے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ تینوں عناصر جنھیں تین مختلف نظریات کے نمائندے پیش کرتے ہیں درحقیقت ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہیں بشرطیکہ قومی سماجی زندگی کے اُن پہلوؤں کو جن کی ترجمانی ان سے ہوتی ہے صحیح زاویۂ نگاہ سے دیکھنے پر یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ اُن سے جدید قوم کے ڈھانچہ میں ایک دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں اسلامی فکر کے نمائندے اس لئے غلطی پر تھے کہ انھوں نے قوم کی اس حقیقت کو نہیں سمجھا جو دینی امت سے علٰحدہ خصوصیت کی حامل ہے۔ انھوں نے شریعت کی بحالی یا اس کی طرف واپسی پر اصرار کیا جس کا مطلب درحقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ قانون جو ایک اُمت کے لئے موزوں تھا اسے تمدنی شکل دے دی جائے۔ وہ اسلام کی عالمگیر صداقتوں اور اُن عوامل میں فرق نہ کر سکے جو سماجی اور زمانی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے مذہبی رسوم اور قانون کو مذہب کے ہم معنی سمجھا۔ اس طرح انھیں اسلام

۱۔ گوکلپ نے مذہب اور فقہ کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔

کے پیغام کو جو پاک اور اچھے انسانوں کے لئے ہے سمجھنے میں ناکامی ہوئی۔ ان کی نگاہیں اسلام کے اخلاقی کردار کو نہ پاسکیں۔ انھوں نے اسلام کو ایسا بنا دیا تھا گویا وہ رسوم و قوانین کے پیچیدہ ضابطوں کا گورکھ دھندا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر نئی چیز کے مخالف ہو گئے کیونکہ انھوں نے زندگی اور قانون کو ایک ہی سمجھا۔ انھوں نے رہی سخت گیری بحال رکھنی چاہی بلکہ جدید حالات کے تحت اس میں اور اضافہ ہوتا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس رجحان کا قوم کی ضرورتوں سے شدید تصادم ہوا اور یہیں سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام اور جدید تمدن ہم آہنگ نہیں ہیں اور دونوں ساتھ نہیں چل سکتے۔ مغربیت کے شیدائیوں کی یہی سب سے بڑی الجھن بھی ہے اور ان کا بنیادی عقیدہ بھی۔

لیکن دوسرا گروہ بھی راہ صواب سے ہٹا ہوا تھا، وہ اسی طرح "نقبیت" کا علمبردار تھا جس طرح مغرب پرست مغربیت کے اندھے پرستار تھے۔ تنظیمات کے مغرب پرست رہناؤں نے اپنی ناقابل انکار عظیم خدمات کے باوجود ٹھوکریں کھائیں کیونکہ ان کے سامنے کوئی تہذیبی خاکہ نہیں تھا۔ انھوں نے جو کچھ کیا اسے کٹھ پتلی کی طرح کرتے رہے۔ ان کے پیش نظر بامعنی مقاصد نہیں تھے، وہ تمدنی فریب میں مبتلا رہے، مثلاً انھوں نے عوام کو یہ سمجھانے کی ناکام کوشش کی کہ عثمانی برادری ایک قوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا سیاسی نظام جدید جمہوریت پسند اقوام کے سیاسی ڈھانچے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ایک استبدادی مذہبی نظام جب کسی حد تک مغربیت کے سانچہ میں ڈھالا جائے گا تو اس کے اندر جدید تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی لیکن یہ مقصد تو حاصل نہیں ہوا البتہ اس نے مغرب کی تمام سطحی باتوں کے داخل ہونے کا پورا موقع فراہم کر دیا اور یہی پہلو غالب ہو گیا۔

صحیح زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو بہرحال یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مغربیت کا سانچہ نہ صرف ترکی کے قومی کلچر سے مطابقت رکھتا تھا بلکہ اس کی شادابی و عروج کے لئے لازمی بھی تھا۔ ایک مکمل قومی تہذیب اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب اس کے خام مواد میں تمدن کی جدید تکنیک کو استعمال کیا جائے اور اس تمدن کی تخلیق میں بہت سی قوموں نے حصہ لیا ہو۔ مغربی تمدن اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس نے اس خیال کی تردید کی کہ اسلام ایک تمدن ہے اور مغربی تمدن عیسائیت کے مترادف

ہے ۔ مغربی تمدن جس میں ثبوتی فلسفے اور عقلیت پسندی کا غلبہ ہے سب قوموں کے لئے ہے چاہے کوئی قوم عیسائی ہو، مسلمان ہو یا جاپانیوں کی طرح نہ عیسائی ہو نہ مسلمان ۔ تمدن بنیادی طور پر اقدار کی جانچ سے غیر متعلق ہوتا ہے، اس لئے تمدن بھی سیکولر ہے اور یہی اس کا مزاج ہے ۔ اس لئے جدید مغربی تمدن کو قبول کرنے سے ایمان اور قومیت پر کوئی حرف نہیں آتا ۔ اس مسئلہ پر ذہنی انتشار کی وجہ یہ ہے کہ تہذیب کو تمدن سے خلط ملط کر دیا جاتا ہے ۔

بحث کے اس مرحلہ پر ضیا گوکلپ سے یہ توقع تھی کہ وہ اس دلچسپ سوال کا جواب دے گا کہ ترک قوم کا تہذیبی و مذہبی ورثہ کس حد تک مغربی تمدن سے متاثر اور خود اسے متحرک بنا سکتا تھا؟ اس دور کے 'مغرب پرست' اس سے قطعی انکار کرتے ہیں مگر اس کی رائے ان کے برعکس ہے ۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ ترک تہذیب نہ صرف یہ کہ اس کے لئے سازگار تھی بلکہ جدید تمدن کے تقاضوں کے لئے معاون بھی ۔ اس نے حال کے موجودہ عوامی اداروں کو جانچنے کے بجائے مبہم تاریخ کی طرف رجوع کیا بظاہر اس نے ترک تہذیب کی حقیقی نسلی بنیاد کو دریافت کرنا ضروری سمجھا لیکن چونکہ اس کے دور میں ترکیاتی مطالعہ ابتدائی دور میں تھا، اس میدان میں اس کی لیاقت دوسروں کے مقابلہ میں کم تر درجہ کی تھی اور وہ مواد جو اس نے استعمال کیا اس میں خامی تھی اس لئے اس کی تحقیقات یا کم از کم اس کے اصول مشتبہ ہو جاتے ہیں پھر بھی گوکلپ کے نتائج بالکل نئے اور اس کے معاصرین کے لئے دلکش ہیں ۔ اس نے پوری جرأت کے ساتھ اعلان کیا کہ ترک تہذیب کی بنیادی خصوصیات مشرقی اداروں کے وہ امتیازی اوصاف نہیں ہیں جو مغربی تمدن کے خلاف سمجھے جاتے اور ترکوں کے ساتھ صدیوں سے وابستہ ہیں مثلاً تعدد ازدواج، پردہ، عورتوں کی کمتر حیثیت، تقدیر پرستی اور ترک دنیا، نیز مریضانہ مشرقی موسیقی اور خدائے برتر کا خوفناک تصور ترک تہذیب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ۔ یہ باتیں ترک مسلمانوں پر لادی گئی ہیں خاص طور پر مشرق قریب کی تمدنی روایات کے ذریعہ جو فقہ کی کتابوں، مدرسہ کی تعلیم، محلوں اور اس کے ادب میں سرایت کر گئی تھیں لیکن اس نے ترکوں کی مخصوص قومی خصوصیات پر کبھی غلبہ نہیں حاصل کیا، ان کا اثر ایک خاص طبقہ پر پڑا جسے ہم عثمانی متمدن دانشوروں کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔

بالکل یہی خصوصیتیں روایتی طور پر اسلام سے منسوب تھیں لیکن گوکلپ کے نزدیک وہ اسلام کا حقیقی جزو نہیں ہیں، اس کا خیال ہے کہ ان کا کہیں اور سے ربط ہے۔ کچھ عربی عناصر اور دوسرے درجہ پر ایرانی تہذیب شریعت میں داخل ہو چکی تھی۔ جب ایک خاص دور میں ایک مخصوص سماجی گروہ کے تہذیبی عناصر مشترک تمدنی عناصر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں تو وہ قومی مزاج پر تنقیدی قدر بن کر کتاب، قانون اور حکومت کے ذریعہ عائد کرنے کی کوشش کرتے ہیں،

ایسے عادات و رسوم یا خیالات جو ترک عوام میں موجود ہیں مگر جدید تمدن سے متضاد ہیں ان کے متعلق گوکلپ کا خیال ہے کہ وہ مردہ ادارہ کی باقیات ہیں اس لئے انھیں قلع قمع کرنے میں آسانی ہے۔ اس نے مصلحین پر ہمیشہ زور دیا کہ انھیں ان سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ بیکار اور سماجی جسم کے حشو و زوائد میں سے ہیں اور انھیں قومی زندگی کو نقصان پہنچائے بغیر ایک ہی وار میں ختم کر دینا چاہئے بشرطیکہ قومی زندگی کو تازہ تہذیبی اور تمدنی غذا دی جائے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ضیا گوکلپ کی تعلیمات کے محسوس اثرات کیا تھے؟ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قوم اور عوام کو آخری تہذیبی، سیاسی اور معاشی اکائی تصور کر کے اس نے ترکی کے لئے قوم، قومی حکومت اور بالآخر جمہوریت کے مقصد تک پہنچنے کی راہ ہموار کی۔ ترکی کو الٰہی نظم حکومت کے تصور سے ہٹا کر اس نے ترکوں کو مذہب اور تہذیب و تمدن کے سیکولر نقطۂ نظر سے آشنا کیا۔ اس نے ترک تہذیب کی بنیاد پر مغربی تمدن کی تعمیر کی متحرک پالیسی کے لئے زمین ہموار کی۔ اس نے ترکوں کے ماقبل اسلامی عہد سے متعلق تاریخی و عمرانی دلچسپی کا آغاز کیا اور شریعت کے نظریاتی خاکہ میں اسلام کو جس طرح سمجھا گیا تھا اس کے برخلاف حقیقی اداروں کے مطالعہ کی ابتدا کی۔ اس نے عوامی تہذیب کی توانائی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی۔ اگرچہ موجودہ دور کے ترک اور غیر ملکی عالموں کے مقابلہ میں تاریخ، عوامی گیت اور عمرانیات پر اس کی تحقیقات کم تر درجہ کی ہیں پھر بھی اس اعتبار سے اس کا درجہ اونچا ہے کہ اس نے اس راہ میں سب سے پہلے قدم رکھا۔ موجودہ ترکی میں اس کے کچھ خیالات فراموش کر دئے گئے ہیں اور چند باتیں جو اس کے زمانے میں نئی تھیں اب پیش پا افتادہ

معلوم ہوتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حقیقت بن گئی ہیں، پھر بھی ان سے اس کی گہری بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ بحیثیت ایک فلسفی اور ماہر عمرانیات کے اس کے اندر جو بھی خامیاں ہوں ضیا گوک الپ ترکی کی تاریخ میں ایک بڑے مفکر کی حیثیت سے زندہ رہے گا، ایسا مفکر جو موجودہ مسائل پر غیر معمولی بصیرت اور روشن مستقبل کا سچا عرفان رکھتا ہو۔

انور صدیقی

نہرو ——— ایک ادیب

ہر بڑی شخصیت کی طرح نہرو کی شخصیت بھی ہمہ جہت تھی۔ اس کے کئی پہلو اور کئی رنگ تھے۔ یہ پہلو اور یہ رنگ متضاد نہیں، ایک دوسرے سے ہم آہنگ تھے ——— ایک فعّال، خلّاق اور حسّاس وجود کا حصّہ۔ وہ ایک عظیم سیاسی رہنما، مورخ اور نئے منصوبوں کے معمار تھے۔ اِن سب کے علاوہ وہ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ اُن کی اِس حیثیت کے بارے میں اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے اور اس کا اعتراف بھی کم کیا گیا ہے۔ مجھے اُن کی تحریریں پڑھ کر کبھی کبھی تو یہ گمان گزرا ہے جیسے وہ بنیادی طور پر ایک ادیب ہوں اور ان کی دوسری سرگرمیاں یا کارنامے صرف کسی نہ کسی قومی مجبوری کا نتیجہ۔ اس لئے خواہ ادب ہو یا سیاست اُن سب میں اُن کا ردّعمل ایک ادیب یا تخلیقی فن کار کا ردعمل ہوتا تھا۔ دراصل نہرو کے لئے بھی ان کی اپنی ذات ایک معمہ تھی۔ وہ ایک جگہ انتہائی دلچسپ انداز میں خود اپنی شخصیت اور سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں ادیب یا عالم نہیں ہوں کہ یہ کہہ سکوں کہ قید خانے میں گزارے ہوئے لمحے میری زندگی کے شیریں ترین لمحے ہیں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ پڑھنے لکھنے کی وجہ سے وہ لمحے بہت اچھے گزرے۔ میں ادبی آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی مورخ ہوں۔ میں واقعی ہوں کیا؟ اس سوال کا جواب دینا میرے لئے انتہائی مشکل ہے۔ میں نے بہت سے معاملات میں دخل دیا ہے۔ میں نے کالج میں سائنس پڑھنی شروع کی۔ پھر قانون کی طرف مڑ گیا۔ اس کے بعد زندگی کے ادبی معاملات میں دلچسپی بڑھائی بالآخر جیل جانے کا مقبول پیشہ اختیار کیا۔"

میرا خیال ہے کہ نہرو نے ان تمام مشاغل اور دلچسپیوں سے ادیب کی حیثیت سے کچھ نہ کچھ حاصل ہی کیا ہے۔ سائنس سے انھیں نقطۂ نظر کی معروضیت اور خیال کی وضاحت ملی۔ قانون سے انھیں زبان کی جامعیت اور الفاظ کے موزوں اور مناسب استعمال کی دولت ہاتھ آئی۔ جیل جانے سے بھی انھیں ادیب کی حیثیت سے وہ دروں بینی ملی جس کے بغیر نہ تو اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق ممکن ہے اور نہ ہی محشر جذبات کی وہ کیفیت جو ادب اور ادیب دونوں کے لئے ضروری ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نہرو نے اپنی بیشتر کتابیں جیل میں لکھیں ان کی خود نوشت سوانح حیات 'میری کہانی' اور 'تلاش ہند' جیل کی زندگی کی رہینِ منت ہیں۔ خود نہرو کو جیل کی زندگی کی ادبی اہمیت اور افادیت کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ جیل سے اندرا کو اپنے خطوط کے سلسلے کے آخری خط میں ڈیزرائیلی کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"عام لوگ جنھیں دیس نکالا دے دیا جاتا ہے یا سزائے قید دی جاتی ہے وہ اگر ان مرحلوں اور مشکلوں کو جیل بھی جاتے ہیں تب بھی انتہائی مایوسی اور تلخی کی زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن ایک ادیب ان دنوں کو اپنی زندگی کے سب سے شیریں دن تصور کر رہا ہے۔"

اسی ضمن میں وہ اُن دو معروف و مقبول ادیبوں کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے قید خانے میں اپنے شاہکار لکھے۔ ایک تو ہسپانوی ادیب سروانٹیز (CERVANTES) تھا جس نے ڈون کوئزوٹ لکھی دوسرا ایک انگریز ناول نگار بن ین (BUNYAN) تھا جس کی تصنیف THE PILGRIM'S PROGRESS (ایک زائر کی سرگزشت) انگلستان میں بائبل کے بعد سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اِن ادیبوں کی مثال نہرو کے سامنے تھی۔ چنانچہ انھوں نے بھی اپنی زندگی کے بے شمار لمحوں کو ادب و علم کے تابع کر دیا اور چند ایسی کتابیں لکھ دیں جن سے ان کا بھی اعتبار و افتخار ہے اور ملک کا بھی۔ اپنی خود نوشت 'سوانح حیات' کے اختتامیے میں کس قدر فنکارانہ مہارت اور دلسوزی کے ساتھ لکھتے ہیں:

"مجھے وہ سال یاد آتے ہیں جو میں نے زنداں میں گزارے ہیں: تنہا بیٹھے ہوئے، اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے، میں نے بہت سے موسموں کو گزرتے اور ایک دوسرے کو فنا کی آغوش میں لے جاتے

دیکھا ہے۔ میں نے کتنے چاند ماند پڑتے اور ستاروں کے کتنے ہی پُرشکوہ جلوس گزرتے دیکھے ہیں۔ میرے
کتنے گزشتہ دن یہاں دفن ہیں۔ میں نے کبھی کبھی ایسے گزشتہ دنوں کی روحوں کو بیدار ہوتے اور
بہت سی دل خراش یادیں جگاتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ میرے گزشتہ دنوں کی روحوں
نے مجھ سے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا ہے، "کیا یہ دکھ سہنے کے قابل تھے؟"

نہرو کی علمی اور ادبی زندگی کی تعمیر میں مشرق و مغرب کی بہت سی برگزیدہ ذہنی اور فنی روایات کی کارفرمائی ہے۔ انھیں خیال کی وضاحت مغرب سے ملی اور جذبات کی لطافت مشرق سے۔ وہ تاریخ کے اس دور کے پروردہ تھے جب علوم انسانی اور سائنسی علوم ایک دوسرے کے دشمن نہیں، رفیق تھے۔ جب شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں شعر و ادب کو بھی ان کا جائز حق دیا جاتا تھا۔ یوں کہیے کہ ان کے بغیر شخصیت نامکمل و ناتمام سمجھی جاتی تھی۔ نہرو اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی مغرب بالخصوص انگلستان کے کلاسیکی ادبی سرمائے سے واقف ہو چکے تھے اور جدید انگریزی نثر نگاروں اور شاعروں کے فنی کمالات سے ایک طرح کی زندہ آگہی حاصل کر لی تھی۔ ان ادیبوں اور شاعروں نے نہرو کی ادبی شخصیت کی نشو و نما میں بڑا اہم حصہ لیا ہے اور ان کے شعور و احساس کے پیمانوں کو طرح طرح سے متعین کیا ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں، پھر بھی یہاں ان چند شاعروں اور ادیبوں کا ذکر ضرور کروں گا جن کے حوالے یا اقتباسات نہرو نے اپنی مختلف تحریروں میں دیے ہیں۔ انگریزی نثر نگاروں میں وہ سب سے زیادہ والٹر پیٹر (WALTER PATER) اور آسکر وائلڈ سے متاثر رہے ہیں۔ یہ جمال پرست وہ ہیں جنھوں نے حسن و جمال کو مذہب کا نعم البدل سمجھا اور ان کی تلاش و طلب میں انھیں وہی کیف حاصل ہوا جو کبھی انسانوں کو عبادت سے حاصل ہوتا رہا ہوگا۔ نہرو نے اپنی خود نوشت میں پیٹر کے نقطۂ نظر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس کے تصورات نے انھیں اپنی نفاست پسندی کی وجہ سے ایک عرصے تک اپنا گرویدہ بنائے رکھا۔ پیٹر جمالیاتی انسان کی تخلیق کے خواب دیکھ رہا تھا اور اسے امید تھی کہ یہ انسان مادی انسان یا اقتصادی انسان کے احساس و نظر کی تمام بدصورتیاں مٹا کر رکھ دے گا۔ مگر اس کے جمالیاتی انسان کا زوال حیاتیاتی انسان کے ہاتھوں جس طرح ہوا وہ ایک الگ داستان ہے جس کے سنانے کی نہ تو مجھ میں تاب ہے اور نہ

ہی آپ میں سمٹنے کی سکت۔ لہٰذا اسے کسی اور موقعے کے لئے چھوڑتا ہوں۔ نہرو نے پیٹر سے تاریخ نگاری کا وہ انداز سیکھا ہے جسے ہم تاثراتی انداز کہتے ہیں۔ پیٹر ہی کی طرح نہرو نے بھی تلاش ہند اور دوسری تاریخی اور نیم تاریخی تحریروں میں ماضی کی تخیلی باز آفرینی کی ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ علمی موضوعات کے لئے یہ انداز مناسب ہے یا غیر مناسب۔ ویسے نہرو نے تلاش ہند خود اپنے لئے لکھی تھی اس لئے کہ اساطیری دھند میں لپٹا ہوا ہندوستان اُن کے لئے، اُس ساری محبت کے باوجود جو اُنھیں اس سے تھی، کبھی کبھی پریشان کن محسوس ہوتا تھا۔ اُسے وہ جاننا اور سمجھنا چاہتے تھے۔ اس جاننے اور سمجھنے کے عمل کی رزم گاہ خود ان کا اپنا احساس رہا ہے۔ اس لئے تاثراتی انداز بیان کچھ زیادہ گراں نہیں گزرتا۔ نہرو کی خود نوشت سوانح حیات اور خطوط میں مجھے آسکر وائلڈ کی مشہور کتاب (DE PROFOUNDIS) کی گونج جگہ جگہ پر سنائی دیتی ہے۔ یاد رہے کہ آسکر وائلڈ نے بھی یہ کتاب جیل میں لکھی تھی اور اُس میں بھی بیان کا وہ انانیتی رنگ ہے جو نہرو کی بیشتر تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ خود انھیں بھی اپنی تحریروں پر اس عنصر کے غلبے کا اعتراف تھا۔ انگریزی شعراء میں وہ طامس مور، پوپ، ولیم بلیک، ورڈسورتھ، شیلی، آرنلڈ اور براوننگ کے کلام سے اپنے علمی اور ادبی نگارخانے سجاتے ہیں۔

نہرو لفظوں کے موزوں استعمال پر زور دیتے رہے ہیں۔ انھوں نے ۳ رنومبر ۱۹۴۰ء کو گورکھپور جیل میں ایک مقدمے کی سماعت کے دوران بیان دیتے ہوئے کہا تھا:

> "میں لفظوں اور ترکیبوں کا عاشق ہوں اور اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ ان کا مناسب اور موزوں استعمال بھی کروں، میرے خیالات خواہ کچھ بھی ہوں لیکن میں جو الفاظ استعمال کرتا ہوں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ میرے خیالات کا صاف اور مربوط اظہار کریں۔"

نہرو کی تحریروں میں صاف، سادہ اور شائستہ زبان بھی ہے اور خیالات کا مربوط و مسلسل اظہار بھی۔ انھوں نے اپنی مختلف تحریروں میں بیان کے کئی اسلوب اختیار کئے ہیں۔ صرف چند تحریروں میں خالص علمی زبان لکھی ہے اور اسلوب بھی قدرے غیر شخصی ہے۔ ورنہ عام طور سے ان کا انداز بیان شخصی ہے۔ وہ رُومانی نسل کے بہت سے ادیبوں کی طرح زندگی، زمانے اور تاریخ کو اپنے احساس کی وساطت

یا دسیلے سے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے ۔ اس لئے ان کے عام اسلوب پر ذاتی ادراک کی کاوشوں اور کاہلیوں کے بہت سے نقش ملتے ہیں ۔ غالباً اسی وجہ سے انھوں نے بعض اوقات مکتوبی انداز اختیار کیا ہے جس میں ادیب کی اپنی شخصیت کی ہر لحہ موجودگی ناگوار نہیں، خوشگوار اثر پیدا کرتی ہے ۔ اُن کے خطبات میں جملوں کی ساخت کچھ ایسی ہے جس سے تقریری آہنگ کا احساس ہوتا ہے ۔ اُن کے مختلف اسالیب اظہار میں جو چیز سب سے نمایاں بھی ہے اور مشترک بھی، وہ ہے ان کے فکر اور احساس کی تیز روی ۔ اِس تیز روی میں نہرو کے احساس کے وفور اور ناصبوری کی بڑی فن کارانہ کارفرمائی ہے ۔

ہندوستان میں انگریزی زبان کے جو چند رمز آشنا اور برتنے والے گزرے ہیں، ان کی فہرست میں نہرو کا نام پورے اعتماد کے ساتھ شامل کیا جاسکتا ہے ۔

عماد الحسن آزاد فاروقی

"شعوبیہ"

تاریخ اسلام کی ایک اہم تحریک

اسلام کی چودہ صدیوں میں بے شمار تحریکیں اٹھتی اور فنا ہوتی رہی ہیں۔ ان میں بیشتر تحریکیں ایسی تھیں جنھوں نے اسلام کے بنیادی دھارے پر کوئی اچھا یا برا اثر نہیں ڈالا مگر بعض تحریکیں ایسی بھی تھیں جنھوں نے تاریخ اسلام کے دھارے کو ایک نیا موڑ دیا اور ان کا اثر علم و سیاست، تہذیب اور معاشرہ پر گہرا اور پائدار ثابت ہوا۔ شعوبی تحریک کا شمار بھی تاریخ اسلام کی ایسی ہی تحریکوں میں کیا جا سکتا ہے۔ خاندان بنو امیہ کا زوال کس طرح ہوا، اسلام اور مسلمانوں کی قیادت کیسے عربوں کے ہاتھ سے نکل کر بنیادی طور پر عجمیوں کے ہاتھ میں آگئی، اسلامی تہذیب و تمدن کی ترقی میں کس طرح عجمی عناصر نے نمایاں حصہ لیا، ان تمام سوالوں کا جواب ہمیں مل جائے گا اگر ہم کو شعوبی تحریک کی ماہیت اور اس کے اثرات کا سراغ مل جائے۔

شعوبی تحریک کو سمجھنے کے لیے ہمیں جاہلی زمانے کے عربوں سے شروعات کرنی ہوگی جن کی پوری زندگی کا محور ان کی عصبیت ہوتی تھی، وہ عصبیت کو اپنے خون میں لئے ہوئے پیدا ہوتے تھے، اس کے لئے ہر چیز کو قربان کر دینے کی تربیت پاتے تھے اور اسی کی حفاظت کرتے ہوئے ساری زندگی گذار دیتے تھے۔ مگر اس بات کو نظر میں رکھنا چاہیئے کہ اس عصبیت کی ساری حدیں قبیلہ پر جا کر ختم ہو جاتی تھیں۔ ان کی ساری وفاداریاں، جذبات اور امنگیں قبیلہ ہی تک محدود تھیں۔ اس زمانے کے عربوں میں اگر ہم کسی قسم کے قومی شعور کی تلاش کریں تو ہم کو مایوس ہو جانا پڑے گا، یا اگر ہم اسے کہیں کہیں محسوس کریں تو وہ اس قدر

کمزور ہوگا کہ اس پر صحیح معنوں میں قومی شعور کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہی عرب جب اسلام قبول کرکے ایک حکومت اور چند مسلمہ اور مشترک قوانین کے ماتحت ہو گئے اور انھوں نے اپنے وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کو فتح کر لیا جس کا کہ وہ کبھی تصور نہیں کر سکتے تھے اور جن کو اپنے مقابلے میں وہ عرصہ سے برتر اور بہت زیادہ طاقتور سمجھتے آئے تھے۔ تو ان کو یقین ہو گیا کہ عرب خون ایک ممتاز خون ہے اور چونکہ ان فتوحات میں کئی عرب قبائل شامل رہتے تھے اس لئے یہ امتیاز بھی ساری عرب نسل کی ملکیت بن گیا اور وہ تعصب جو پہلے قبیلے ہی تک محدود تھا اب پوری عرب امت پر محیط ہو گیا۔ اسلام سے پہلے کی جنگوں میں مفتوح دشمن کا ہر فرد غلام سمجھا جاتا تھا مگر اسلام کے بعد مفتوحہ اقوام میں سے بہت سے لوگ اسلام قبول کرکے مساوات کے اس برتاؤ کی توقع رکھتے تھے جو اسلام کی ایک بنیادی تعلیم تھی، مگر عربوں کے نقطۂ نظر میں مکمل تبدیلی نہ آسکی تھی اور وہ اس احساس کا قولاً اور فعلاً اظہار کرتے رہتے تھے کہ یہ نومسلم وہی لوگ ہیں جنھیں ہم نے غلام نہ بنا کر ہی بڑا احسان کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب غیر عرب مسلموں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا تو انھوں نے مال غنیمت کی تقسیم اور جنگی مصالح کی بنا پر ہر نومسلم کو کسی عرب گھرانے سے متعلق کرنا شروع کر دیا۔ زیادہ تر اس سلسلے میں اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ غیر عرب جس کے ہاتھ پر مسلمان ہوا ہے یا جنگ میں جس عرب نے اسے قیدی بنایا ہے اسی سے متعلق کیا جائے۔ اکثر نومسلموں کے بڑے گروہوں کو جن میں کوئی بات مشترک ہوتی تھی ..... من حیث الجماعت کسی قبیلہ سے منسلک کر دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے اس نظام کے جاری کرنے میں بہ نسبت دورِ جاہلیت کی روایت کے کہ آزاد کردہ غلام کا تعلق سابق آقا سے باقی رہے۔ انتظام کی آسانی زیادہ مقصود تھی۔ اس لئے کہ دوسری سہولیات کے علاوہ .... حضرت عمرؓ نے یہ نظام .... اس لئے بھی قائم کیا کہ اس وقت فوج کی تنظیم قبیلوں ہی کی بنیاد پر ہوتی تھی اور ہر قبیلہ الگ الگ فوج کا ایک عنصر سمجھا جاتا تھا۔ وہ عرب قبیلہ یا عرب گھرانا جس سے کہ یہ غیر عرب نومسلم متعلق کئے جاتے تھے ان نومسلموں کا سرپرست سمجھا جاتا تھا اور ان سے متعلق چند ذمہ داریاں اور اُن پر چند حقوق رکھتا تھا۔ ان ذمہ داریوں اور حقوق کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی، البتہ اُن کا شمار اخلاقی فرائض

میں کیا جاتا ہے۔ ایک عرب اور ایک نومسلم کے اس تعلق کو ولاۃ اور اس نومسلم کو اس عرب کا مولیٰ یعنی حلیف کہا کرتے تھے۔

حضرت علیؑ کی خلافت تک عام طور پر موالیوں یعنی غیر عرب مسلموں کے ساتھ تقریباً مساویانہ سلوک ہوتا رہا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ خلفائے راشدینؓ کا طرز حکومت اسلامی اصولوں پر مبنی تھا اور وہ بہر قیمت تمام مسلمانوں میں، خواہ وہ عرب ہوں یا عجمی، اسلامی مساوات کا اصول قائم رکھنا چاہتے تھے، ہر چند کہ عربوں میں ایک عنصر ایسا تھا جسے خلفاءؓ کا یہ طریقہ کھٹکتا تھا مگر وہ ایسے دبدبے والے تھے اور اسلام کے اصول انھیں اتنے عزیز تھے کہ وہ ان معاملات میں کسی سے کوئی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ مدائنی لکھتا ہے کہ حضرت علیؑ کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ ان کے پاس گئے اور کہنے لگے۔ "امیر المومنین آپ (لوگوں میں) مال کو تقسیم کیجئے اور اشراف عرب اور قریش کو موالیوں پر فضیلت بخشئے اور اس طرح اپنے مخالفوں کو موافق بنائیے۔" (اور ان لوگوں نے حضرت معاویہؓ کی پالیسی کو دیکھ کر یہ کہا تھا) اس پر حضرت علیؑ نے جواب دیا کہ "کیا تم چاہتے ہو کہ میں ظلم کے ذریعہ کامیابی حاصل کروں ؟"[۱]

دوسری طرف مساوات کے اس اصول پر بغیر کسی خاص دقت کے عمل درآمد کی یہ وجہ بھی تھی کہ شروع کا زمانہ انتہائی تیز رفتار فتوحات کا زمانہ تھا۔ عرب اور غیر عرب سبھی مسلمان پورے طور پر فتوحات میں مشغول تھے۔ عربوں کو اس وقت میدان جنگ کے اندر اور باہر ہر جگہ نومسلموں کی پوری اعانت کی ضرورت تھی، نیز اس عظیم پیمانے پر جہاد کی سرگرمیوں نے ان کی ساری توجہات کو ایک طرف مرکوز کر رکھا تھا۔ مگر جب جنگوں کا سلسلہ کچھ رکا اور رساج میں قرار اور استقلال کی کیفیات پیدا ہوئیں تو ان تعصبات کو جو وقتی طور پر دبے ہوئے تھے اور ساز گار حالات کے منتظر تھے، پھر ابھرنے کا موقع ملا۔

بنو امیہ بنیادی طور پر جاگیردارانہ ذہنیت کے حامل تھے۔ انھوں نے عرب عصبیت کے میلانات کو ہوا دے کر حکومت حاصل کی تھی، خود صدق دل سے اس کے قائل تھے اور انھوں نے اس کو اپنے

---

[۱] شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید عن المدائنی جزء ۱ : ۱۸۰

نظام حکومت کی بنیادی پالیسی قرار دیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دور حکومت میں روز بروز عرب اور غیر عرب میں خلیج بڑھتی گئی۔ عرب موالیوں کو آزاد کردہ غلام سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے کسی طرح تیار نہیں تھے۔ عرب خون کی برتری پر انھیں یقین تھا اور وہ عرب حکومت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اُس زمانے کے ادب اور تاریخ میں اس کی بے شمار شہادتیں ملتی ہیں۔ مثلاً آغانی کی روایت ہے کہ موالی میں سے ایک شخص نے بنی سلیم کی ایک لڑکی سے نکاح کر لیا تھا اس پر محمد ابن بشیر خارجی، مدینہ کے گورنر ابراہیم ابن ہشام ابن اسماعیل کے پاس شکایت لے کر پہنچا، ابراہیم نے فوراً اس مولیٰ کو بلوا کر طلاق دلوائی، پھر اس کو دوسو درّے لگوائے اور تحقیر کے طور پر سر، داڑھی اور بھویں منڈوا دیں اس پر محمد بن بشیر نے خوش ہو کر گورنر کو خطاب کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار کہے جن سے عربوں کے نقطۂ نظر کی مزید تشریح ہوتی ہے:

"بے شک تو نے روایات اور انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیا ہے اور حکومت تیرے پاس کہیں دور سے اتفاقاً نہیں آگئی ہے (یعنی تو خاندانی شریف ہے)
"اور یہ دوسو کوڑے اور چار ابروکا صفایا ایک مولیٰ کے لئے عمدہ تنبیہ ہے۔
"اور ان موالیوں کے لئے تو نومسلم لڑکیاں ہی بہت مناسب ہیں، آخر وہ اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہیں۔
"ان موالیوں کے لئے اس فیصلہ سے زیادہ حق اور انصاف اور کیا ہوگا کہ غلاموں کے رشتے غلاموں ہی سے باقی رہیں۔"

حجاج بن یوسف جس کا شمار اموی حکومت کے اہم ارکان میں ہوتا ہے اس سلسلے میں بہت متشدد تھا۔ عراق کی گورنری کے زمانے میں اس نے تمام نبطیوں کے ہاتھوں پر نشتر سے نشان بنوا دیئے تھے کہ الگ پہچانے جائیں۔ کوفہ میں اس نے حکم دے رکھا تھا کہ کبھی کسی موالی کو امام نہ بنایا جائے۔ اس نے

۱؎ آغانی جزء ۱۴: ۵۰ ۲؎ شرح ... جزء ۲: ۱۳۳ ۳؎ العقد الفرید جزء ۱: ۲۰۲

بصرہ کے گورنر کو ایک خط میں لکھا کہ اپنی مجلس میں کسی موالی کو راہ مت دو۔ اس نے جواب میں لکھا کہ میں نے سوائے عالم اور حفاظ قرآن کے اور تمام موالیوں کو روک دیا ہے اس پر حجاج نے اسے تنبیہاً لکھا کہ میرا خط ملتے ہی اطبار سے رجوع کرو اور ان سے اپنے بدن کی جانچ کراؤ اور اگر کوئی نیلی رگ تمھارے بدن میں پائی جائے تو اُسے کٹوا دو[1]۔

اصفہانی لکھتا ہے کہ دولت عباسیہ سے قبل عربوں کا یہ حال تھا کہ بازار میں جا کر سامان وغیرہ خریدتے اور کسی موالی کو دیکھتے تو اُسے بلا کر سامان اٹھوا کر گھر لے آتے اور اگر کوئی موالی سوار ہو کر جاتا ہوتا تھا اور کسی عرب کو ناگوار گذرتا تو اس موالی کو اترنا پڑتا تھا، اور اگر کوئی عرب کسی موالی کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا تو بجائے اُس لڑکی کے والدین کے اس کے عرب سرپرست کو پیغام بھیج دینا کافی سمجھتا تھا[2]۔

یہ تعصب اور نفرت صرف موالیوں سے ہی نہیں تھی بلکہ وہ ان لوگوں کو بھی جو باپ کی طرف سے عرب اور ماں کی طرف سے غیر عرب ہوں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کو "ہجین" کہکر پکارتے تھے یہ لفظ ہجنہ سے مشتق ہے جس کے معنی عیب دار کلام کے ہوتے ہیں۔

جاحظ لکھتا ہے کہ "میں نے عبید الکلابی سے جو ایک زبان دان لیکن غریب آدمی تھا، پوچھا: "کیا تم اس بات سے خوش ہو جاؤ گے کہ تم کو ایک ہزار جریب زمین مل جائے مگر تم ہجین ہو جاؤ"۔ اس نے کہا "میں یہ ذالت کسی چیز کے بدلے میں نہیں قبول کر سکتا"۔ میں نے کہا "امیرالمومنین کی ماں بھی تو باندی تھیں"۔ اس نے کہا "اللہ کی پھٹکار اس پر جو اُن کی پیروی کرے"۔ محمد ابن عبداللہ بن الحسن بن الحسن بن علی کرم نے خلیفہ منصور کو عار دلاتے ہوئے لکھا کہ "جان لو کہ میں آزاد کردہ لونڈیوں کی اولاد میں سے نہیں ہوں اور نہ میرے خون میں کسی باندی کے خون کی کچھ ملاوٹ ہے اور نہ مجھے امہاتِ اولاد نے دودھ پلایا ہے (ام الولد وہ باندی کہلاتی تھی جس سے کہ آقا کے کوئی اولاد ہو جاتی تھی)

ان مثالوں سے اور اس قسم کے دوسرے شواہد سے جو اُس زمانے کی کتابوں میں ملتے ہیں، اس

---

[1] محاضرات الادبار ۱: ۲۱۸ [2] محاضرات الادبار ۱: ۲۲۰

بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلم سماج میں زبردست فرق آگیا تھا، بجائے اس کے کہ اسلام کی حکومت ہوتی اسلام محض حکومت کرنے والوں کا مذہب بن گیا۔ اس سماج کا اعلیٰ طبقہ عربوں پر مشتمل تھا، اہم اور بڑے عہدوں کے لئے لوگ انھیں میں سے چنے جاتے تھے۔ سبھی عربوں کو جو فوجی خدمت انجام دیتے تھے پنشن ملتی تھی جب کہ موالیوں کے لئے صرف تنخواہ اور مال غنیمت کا حصہ تھا۔ عرب سوار ہوکر لڑتے تھے موالی پیدل فوج کی خدمت انجام دیتے تھے یہ عرب اور غیر عرب کا فرق اُس زمانے کے مسلم سماج کا صرف ایک تاریک پہلو تھا۔ اب اگر ہم دیکھیں تو خود عربوں کے درمیان ہمیں انتہائی شدید نزاعات ملیں گے خصوصًا شمالی عرب یعنی عدنانیوں اور جنوبی عرب یعنی یمنیوں یا قحطانیوں کے درمیان جو ایک مستقل کش مکش جاہلی زمانے سے چلی آرہی تھی پھر تازہ ہوگئی، اور اس قدر شدت سے تازہ ہوئی کہ جس طبقہ کا حاکم برسر اقتدار آجاتا تھا وہ دوسرے طبقہ کے گناہ گار اور بے گناہ سب کو اپنے عتاب کی گرفت میں لے لیتا تھا۔ بنو امیہ چونکہ عدنانی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے یقینًا عدنانیوں کا پلہ بھاری تھا مگر کہیں کہیں قحطانی امرا کا اس قدر زور تھا کہ ان پر ہاتھ ڈالنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لئے وہ عدنانی امرا کی زیادتیوں کا بدلہ اپنے محکوم لوگوں سے بس بھر نکالتے تھے۔ مگر آپس کے ان اختلافات کے باوجود پورا حکمراں طبقہ اور جاہل عوام موالیوں سے نفرت کرتے اور انھیں آزاد کردہ غلام سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔

اس تعصب سے جو شیوخ عرب، حکمراں طبقے اور جاہل بدویوں پر یکساں محیط تھا ہمیں محض ایک طبقہ کچھ الگ نظر آتا ہے جس میں علماء، قراء اور دیندار لوگ تھے، ان کے علاوہ وہ لوگ بھی جو بنو امیہ کی غیر اسلامی پالیسی سے شدید اختلاف رکھتے تھے، یہ لوگ عام طور پر متوسط طبقہ کے افراد تھے اور امویوں کے جاگیردارانہ نظام میں کسی سیاسی قوت کے حامل نہ تھے۔ اموی عہد حکومت میں اس نسلی تعصب کے نتائج مسلم سماج میں کچھ اس طرح ظاہر ہوئے:

اموی حکومت چونکہ اپنی عام پالیسیوں میں اور خصوصًا عدم مساوات کی پالیسی میں اسلام کے صریح اصولوں کی خلاف ورزی کرتی تھی اس لئے موالی اسے قطعًا غیر اسلامی اور جابر حکومت سمجھتے تھے اور ہر

اُس گروہ کا جو حکومت کا مخالف ہو ساتھ دینے پر آمادہ رہتے تھے۔ موالی جن کا بیشتر حصہ ایرانیوں پر مشتمل تھا ماضی میں ایک بڑے تمدن کے حامل رہ چکے تھے اس لئے نئے سماج میں بھی عزت حاصل کرنے کی خواہش ان میں فطری تھی اور جب انھوں نے حکومت کے راستے سے عزت حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں دیکھا تو وہ اسلامی علوم کی طرف متوجہ ہو گئے کہ دین میں ایک خاص مقام حاصل کر کے سماج میں رُتبہ حاصل کریں اور اس میں انھیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ موالیوں نے حدیث، تفسیر، فقہ اور عربی گرامر کی طرف توجہ کی، ان علوم کی الگ الگ تدوین کی اور ان کے اصول متعین کئے۔ ایسی مثالوں کی کمی نہیں کہ محض علم اور علمی قابلیت کی وجہ سے موالیوں کی عزت ہوئی۔ خود حجاج نے جو کہ اس قدر متعصب تھا، سعید بن جبیر کو کوفہ کا امام بنایا یہاں تک بعض موالی علمار اپنے علم وفضل سے اس مقام کو پہنچ گئے تھے کہ خلفار بنو امیہ پر سخت تنقید کرتے تھے، مثلاً حسن بصریؒ اموی خلفار اور اُن کے حلیفوں یزید بن مہلب وغیرہ کو کھلم کھلا فاسق اور گمراہ کہتے تھے، یہ بھی کہتے کہ کاش زمین پھٹ جاتی اور یہ سب کے سب اس میں سما جاتے۔ جن موالی علمار نے اپنے علم وفضل کی بنا پر معاشرہ میں ممتاز حیثیت حاصل کی ان کی فہرست خاصی طویل ہے، الزہری، سردق بن الاجدع، شریح، سعید بن المسیب اور قتادہ وغیرہ ایسے ہی لوگوں میں ہیں علمار نحو میں تو ابتدائی دور میں تقریباً سبھی موالی تھے اور انھوں نے عربی زبان وادب میں وہ مرتبہ حاصل کیا کہ عرب خلفار اپنے لڑکوں کو اُن سے عربی پڑھوانے لگے۔ عوام میں بھی موالی علمار کا اثر ورسوخ بڑھا، یہ علمار خوش قسمتی سے اس تعصب سے بَری تھے جو عام موالیوں میں عربوں کے تحقیر آمیز سلوک کے ردعمل کے طور پر پیدا ہو گیا تھا، اس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ عرب اور غیر عرب سب ان کا احترام کرتے تھے۔

لیکن وہ موالی جو عربوں کے طرز عمل سے بیزار تھے تعداد میں بہت زیادہ تھے، خاص طور سے ایران کے خاندانی لوگوں میں یہ احساس بہت قوی تھا کہ آج وہ اُن عربوں کے مقہور اور مظلوم ہیں جنھیں وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے اور جو تہذیب وتمدن سے ناآشنا تھے، ان خیالات کا اظہار وہ اپنی مجلسوں اور اشعار میں کرتے تھے اور دور دراز علاقوں مثلاً خراسان میں تو برسر منبر کیا کرتے۔ آغانی نے ایسے بہت سے واقعات کو نقل کیا ہے اور واقعات کے پردہ میں اس پر روشنی ڈالی ہے کہ اموی عہد حکومت کے آخری دور

میں موالیوں، خاص طور سے ایرانی موالیوں میں عربوں کے خلاف نفرت اور حقارت کا جذبہ کتنی بھیانک شکل میں ظاہر ہونے لگا تھا۔

موالیوں کے اس احساس کو جب بنو امیہ نے جبر و ظلم سے دبانا چاہا تو اس نے ایک خفیہ تحریک کی شکل اختیار کر لی، موالی اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ اُن کے ساتھ ظلم اور نا انصافی کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ اس لئے اگر حکومت بدل جائے اور کوئی ایسی حکومت قائم ہو جائے جو اسلامی اصولوں کا خیال رکھے تو انھیں عربوں کے مساوی حقوق حاصل ہو جائیں گے۔ ایرانیوں میں سے کسی خاندان کی حکومت قائم کرنے سے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس صورت میں تمام عرب اور دوسرے غیر ایرانی موالی ان کے خلاف ہو جاتے، اس لئے انھوں نے عربوں ہی میں حکومت کے دعویداروں کی تلاش شروع کر دی اور انھیں اہل بیت کے حلقہ میں ایک خاندان ایسا مل بھی گیا۔ انھوں نے اس خاندان کے بعض افراد کو آمادہ کر لیا کہ وہ موالیوں اور عربوں کی ایک جماعت کے بھروسے پر اموی حکومت کے خلاف بغاوت کریں۔ اس تحریک یا امویوں کے خلاف اس سازش میں جو برسوں عراق، ایران اور خراسان میں پروان چڑھتی رہی، جب عباسی خاندان کے لوگ شامل ہو گئے تو اسے اور تقویت ملی اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں عباسیوں نے مسند خلافت پر قبضہ کر لیا۔

(۲)

۱۳۲ھ (۷۵۰-۷۴۹ء) میں بنو امیہ کے خاندان سے خلافت کا بنو عباس میں منتقل ہو جانا، ہر اعتبار سے تاریخ اسلام کا ایک اہم انقلاب تھا، سیاسی، سماجی، علمی اور تہذیبی، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں ہمیں اب ایک نئے دور کا احساس ہوتا ہے اور اس نئے دور کی تعمیر میں اب ہمیں نئے عناصر کی خوبیاں اور کمزوریاں کارفرما نظر آتی ہیں، بنو امیہ نے نسلی میلانات کو ہوا دی تھی، بنو عباس جمہوریت اور مساوات کے دعویدار تھے، اس کی یہ ایک مثال واضح ہے: ایک مرتبہ مامون الرشید کے پاس ایک خارجی آیا اور اس نے کہا کہ "تم جو اپنے باپ کے بعد تخت پر قابض ہو گئے ہو یہ اسلام کے خلاف ہے۔" مامون نے جواب دیا کہ "تم اُمت میں کوئی ایسا شخص ڈھونڈ لو جس پر اکثریت متفق ہو تو میں خلافت سے دستبردار

ہو جاؤں گا۔[۱]

بنو امیہ کی خلافت میں اعلیٰ طبقہ میں شامل ہونے کے لئے نجیب الطرفین ہونا ضروری تھا جبکہ بنو عباس کے دور حکومت میں یہ معیار نہیں رہا۔ بنو امیہ حکومت اور سیاست میں مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے تھے اور فخر کے لئے ایک اونچے خاندان کا ہونا کافی سمجھتے[۲] تھے جبکہ بنو عباس کی بنیادی پالیسی مذہبی تھی اور وہ اپنے خاندان کو خادم اسلام سمجھتے تھے۔

لیکن سب سے زیادہ اہم فرق یہ تھا کہ بنو امیہ کو شکست دینے اور بنو عباس کو برسر اقتدار لانے کا سہرا اُن غیر عرب مسلمانوں کے سر تھا جو کہ بنو امیہ کے دور حکومت میں ہر طرح سے مقہور و معتوب تھے۔ اس لئے لازمی طور پر نئی حکومت سے انھیں فائدے بھی زیادہ پہنچے۔ بنو عباس بھی موالیوں یعنی غیر عرب مسلموں کے اس احسان کا پورے طور پر اعتراف کرتے تھے داؤد بن علی بنو عباس کے دوسرے خلیفہ منصور کا چچا اپنے ایک خطبہ میں کہتا ہے: "اے اہل کوفہ! بے شک ہم (بنو عباس) مظلوم تھے اور ہمارا حق غصب تھا یہاں تک کہ اللہ نے اہل خراسان میں ہمارے مددگار پیدا کر دئے اور ان کے ذریعہ ہمارا حق ہم کو پہنچا دیا اور ہماری دلیل کو ثابت کر دیا اور ہماری حکومت قائم کرا دی اور جس چیز کے تم مشتاق و منتظر تھے اللہ نے تم کو دکھلا دی، تمھارے درمیان بنو ہاشم کی خلافت قائم کر دی اور اس طرح تمھیں نواز دیا اور اہل شام پر تمھیں غلبہ عطا کر دیا۔"[۳] ابو جعفر منصور کہتا تھا "اے اہل خراسان! تم ہماری جماعت ہو، ہمارے مددگار ہو اور ہمارے ہمنوا ہو۔"[۴] جاحظ لکھتا ہے "دولت بنو عباس عجمی اور خراسانی ہے اور دولت بنو امیہ عربی اور خالص عربی تھی[۴]" اور باب خراسان کو بغداد میں باب الدولۃ کہتے تھے کیونکہ دولت عباسیہ خراسان سے ہی وجود میں آئی تھی[۵]۔ منصور نے مرنے سے قبل اپنے بیٹے سے کہا تھا: "میں تجھ کو اہل خراسان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ تمھارے مددگار اور تمھاری جماعت کے آدمی ہیں جنھوں نے کہ تمھاری حکومت کے لئے اپنی جان و مال کو خرچ کیا ہے اور جن کے

---

[۱] حضرت عمر بن عبدالعزیز اور اسی طرح کی دوسری مستثنیات کو چھوڑ کر۔ [۲] طبری ۹ : ۱۲۶ [۳] مسعودی ۲ : ۱۹۰
[۴] البیان والتبیین ۳ : ۲۰۶ [۵] مسعودی ۲ : ۱۸۳

دلوں سے تمھاری محبت نہیں نکلے گی بشرطیکہ ان کے ساتھ تم اچھا سلوک کرتے رہتے[1]۔"

عباسی حکومت کے اہم شعبوں میں موالی کثرت سے داخل ہونے لگے جبکہ بنو امیہ کے دور میں یہ بہت شاذ تھا۔ جعفر منصور اس سلسلہ میں بہت متشدد تھا اور اپنے چاروں طرف اس نے محض موالیوں کو جمع کیا کیونکہ عربوں کی طرف سے اسے ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ اگر حکومت کا دعویٰ کرسکتے ہیں تو عرب ہی کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں اس کی سختی کا یہ حال تھا کہ محل کے معمولی ملازموں میں بھی کسی عرب کو دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ طبری ایک واقعہ نقل کرتا ہے کہ منصور کے محل میں ایک بہت فرمانبردار خادم تھا جس کی رنگت میں کچھ پیلاہٹ جھلکتی تھی۔ منصور نے ایک دن (اس کی رنگت کی وجہ سے) اس سے پوچھا کہ تم کس نسل کے ہو اس نے جواب دیا کہ: عربی، منصور نے پوچھا: کون سے عرب، اس نے کہا: بنو خولان مجھے یمن سے میرے دشمنوں نے قید کر لیا تھا اور غلام بنا کر بیچ دیا پھر میں بنو امیہ کے ہاتھ فروخت کیا گیا، پھر ان کے بعد آپ کے پاس منتقل ہو گیا منصور نے کہا: "کہ تو بہت عمدہ خادم ہے لیکن میرے محل میں کوئی عربی خادم نہیں رہ سکتا، تم جہاں چاہو چلے جاؤ[2]۔" آغانی نے جو روایتیں لکھی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ منصور کے دروازے پر شیوخ عرب کھڑے انتظار کیا کرتے تھے اور موالی آزادی سے محل میں آیا جایا کرتے تھے[3]۔

موالیوں کی حمایت کا یہ سلسلہ صرف منصور پر ہی نہیں ختم ہو گیا بلکہ بعد کے خلفاء نے اس کو پالیسی کے طور پر اختیار کیا اور اس کو اپنا شعار بنا لیا، ہاں معتصم کے بعد اتنا فرق ضرور ہوا کہ ایرانیوں کی جگہ ترکوں نے لے لی۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ بنو عباس کے دور میں عربوں کی وہی پوزیشن ہو گئی تھی جو بنو امیہ کے دور میں موالیوں کی تھی، یا وہ کسی لحاظ سے بھی دوسرے درجہ کے شہری بن گئے تھے، بعض مورخین نے اس سلسلہ میں مبالغہ کیا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ابو مسلم خراسانی جیسا بڑا شعوبی لیڈر اس کا دعویٰ نہ کرتا کہ وہ سلیط بن عبداللہ بن عباسؓ کی اولاد میں سے ہے[4]۔ ایسی مثالیں اور بھی ہیں

---

[1] طبری ۹ : ۲۱۹ [2] طبری ۹ : ۳۱۷ [3] آغانی ۱۸ : ۱۳۸ [4] طبری ۹ : ۱۶۷

کہ بعض اہم آدمیوں نے اپنی خاندانی وجاہت کے لئے کسی شریف عرب خاندان کی ولا تلاش کی[1]۔ اس کے علاوہ خود منصور نے عرب شیوخ کو اونچے عہدوں پر مامور کیا اور اس کے بعد دوسرے خلفاء نے بھی عربوں کو گورنر اور فوج کا سپہ سالار بنایا، ہاں یہ ضرور ہے کہ سیاسی مصالح کی بنا پر عام طور سے موالیوں کو بڑے اور اہم عہدے زیادہ تعداد میں ملے۔ نیز بنو عباس نے اس پر بھی نظر رکھی کہ کوئی موالی بہت زیادہ با اثر نہ ہو جائے مثلاً منصور نے ابو مسلم خراسانی، ہارون نے برامکہ خاندان اور مامون نے فضل بن سہیل کو اُن کی قوت اور اثر دیکھ کر راستے سے ہٹا دیا، اس کے باوجود بنو عباس کے عہد میں عربوں پر موالیوں کا پلہ بھاری ہی رہا، اور یہی وجہ تھی کہ اس پورے دور میں عرب اور غیر عرب کا تنازعہ چلتا رہا۔ عربوں کے خلاف غیر عربوں کی یہی تحریک شعوبیہ کہلاتی ہے۔

بعض شعوبی مصنفین کا خیال ہے کہ لفظ "شعوبیہ" قرآن کی مندرجہ ذیل آیت وجعلناکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند الله اتقاکم سے اخذ کیا گیا ہے ان کا کہنا ہے کہ اس آیت میں "شعوب" سے غیر عرب اقوام اور قبائل سے اہل عرب مراد ہیں، ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ چوں کہ اس آیت میں "شعوب" کا لفظ پہلے استعمال ہوا ہے اس لئے غیر عرب اقوام کو اہل عرب پر فضیلت حاصل ہوئی چنانچہ جو لوگ غیر عرب اقوام کے حامی تھے انھوں نے اس لفظ کو اپنا شعار بنا لیا تاکہ اہل عرب سے ان کی علیحدگی ظاہر رہے۔

مگر ہمیں معلوم ہے کہ یہ لفظ ان لوگوں کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا جو کہ تمام اہل اسلام کو ایک دوسرے کے مساوی بتلاتے تھے اور کسی عربی یا عجمی کو ایک دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے تھے مثال کے طور پر صاحب عقد الفرید کہتے ہیں: "شعوبیہ اہل تسویہ کو کہتے ہیں" اہل تسویہ یعنی جو تمام مسلمانوں میں مساوات کے قائل تھے یا صحاح میں روایت ہے "شعوبیہ ایک ایسا فرقہ ہے جو عربوں پر عجمیوں کو فضیلت نہیں دیتا لیکن جاحظ کی البیان والتبیین یا عقد الفرید و آغانی وغیرہ میں 'شعوبیہ' کا لفظ ان

---

[1] آغانی ۵ : ۵۶

لوگوں کے لئے استعمال ہے جو کہ عربوں کے شدید مخالف اور ان کے مقابلے میں عجمیوں کی افضلیت کے قائل تھے۔

دراصل اموی دور میں موالیوں نے حالات کی ناسازگاری کے تحت محض مساوات کے مطالبہ پر ہی اکتفا کی اور جو لوگ زیادہ شدت سے اس مساوات کے قائل اور علمبردار تھے انھیں "اہل تسویہ" کہا جاتا تھا، اور چونکہ وہ تمام اقوام کی طرفداری کرتے تھے اس لئے انھیں "شعوبیہ" بھی کہتے تھے۔ عباسی دور میں جب انھیں حکومت کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہا تو ان موالیوں نے یا ان میں سے ایک طبقہ نے عربوں کی مذمت اور عجمیوں کی فضیلت بیان کرنی شروع کر دی اور اس سلسلہ میں قرآن کی مذکورہ بالا آیت سے بھی استدلال کیا اور دیدہ و دانستہ "شعوبیہ" کے نام کو شہرت دی اور ساتھ ساتھ اُس دلیل کو بھی جو وہ شعوب کی قبائل پر افضلیت کے لئے دیتے تھے، اس طرح "شعوبیہ" کا لفظ زیادہ مستعمل ہوتا چلا گیا مگر اس نام کا استعمال اہل مساوات اور عجمیوں کی فضیلت کے قائل دونوں طبقوں کے لئے ہوتا رہا، اس لئے کہ جو لوگ مساوات کے قائل تھے وہ بھی کم از کم عربوں کی فضیلت کے تو منکر تھے ہی اور عربوں کے لئے یہ وجہ مخاصمت کافی تھی چنانچہ ابن قتیبہ جیسا عالم بھی اہل مساوات کی مخالفت میں یہ کہتا ہے کہ جس دن تمام انسان بالکل برابر ہو جائیں گے وہ انسانیت کے خاتمہ کا دن ہوگا۔

الغرض عباسی دور میں، جیسا کہ اوپر کہا گیا، شعوبیہ تحریک نے کھل کر اپنے بال و پر نکالے اور اِس کے اثرات سیاست، معیشت اور ادب میں طرح طرح سے نمایاں ہوئے۔ سیاست میں اُس نے گروہ بند سازشوں کی شکل اختیار کی، جب تک خلیفہ طاقتور رہے گروہ بندیاں دبی رہیں، لیکن بعد میں ان سازشوں نے خلافت کو اتنا کمزور کر دیا کہ باد مخالف کا ایک جھٹکا بھی برداشت نہ کر سکی۔ عباسیوں کے دور میں ہم جو وزراء اور امراء کے عروج و زوال کا ایک سلسلہ پاتے ہیں تو اس کی ایک بنیادی وجہ یہی سازشیں ہیں۔

دوسری طرف ادب میں عرب اور غیر عرب کی کشمکش ایک مستقل موضوع بن گئی۔ عربی شعر و نثر دونوں میں اس کی واضح شہادتیں موجود ہیں، موالیوں یعنی غیر عرب شاعروں اور ادیبوں نے عربوں کی تحقیر و تذلیل میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، یہاں تک کہ عربوں کے وہ طبعی خصائص جن پر انھیں فخر تھا،

ان میں ایک ایک کو چن کر ملامت کا ہدف بنایا گیا[1]، سعید بن حمید بختکان نے جو میر منشی کے عہدے پر فائز تھا اور اپنے آپ کو ایرانی بادشاہوں کی اولاد بتاتا تھا، عجمیوں کے مناقب میں کتابیں تصنیف کیں، اس کی تین کتابوں کے نام الفہرست میں درج ہیں (۱) انتصاف العجم من العرب، (۲) فضل العجم علی العرب وافتخارہا، (۳) مفاخر العجم۔ اسی طرح ہیثم ابن عدی نے عربوں کی ہجو اور ذم میں کتابیں لکھیں، الفہرست میں اس کی کئی کتابوں کا ذکر ملتا ہے مثلاً کتاب المثالب الصغیر، کتاب المثالب الکبیر اور کتاب من تزوج من الموالی فی العرب وغیرہ۔ سہل بن ہارون جو کہ بیت الحکمۃ کا افسر اعلیٰ تھا اور بڑے پایہ کا عالم سمجھا جاتا تھا، مسلک کے اعتبار سے شعوبی تھا اور اس قدر متعصب تھا کہ عربوں کی مخالفت میں اس نے بخل کی تعریف میں ایک رسالہ لکھا جس میں یہ ثابت کیا کہ فیاضی اور سخاوت بری چیز ہے اور بخل قابل تعریف ہے، یہ اس نے محض اس لئے لکھا کہ عربوں کی سخاوت مشہور تھی اور انھیں اپنی اس خصوصیت پر فخر تھا۔ علان شعوبی نے "المیدان فی المثالب" لکھی جس میں عربوں کے ہر قبیلہ کی برائیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اور کتابیں ہیں جن کو طوالت کے پیش نظر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایسے شعوبی اشخاص بھی تھے جنھوں نے ضرب الامثال اور اشعار وغیرہ کی تشریح میں تحقیر آمیز قصے گھڑے اور انھیں عربوں کی طرف منسوب کر دیا جیسے مشہور ادیب ابو عبیدہ۔

یہ معاملہ صرف ادب ہی تک محدود نہ تھا بلکہ اس عہد کے رائج علوم میں جہاں کہیں ممکن تھا شعوبیت کے اثرات دکھائی پڑتے ہیں، مثلاً شعوبی مورخین کی لکھی ہوئی کتابوں میں ایسی روایتیں ملتی ہیں جن پر عجمی تعصب کی چھاپ ہے، انھوں نے ایرانی حکمرانوں اور ایرانی تہذیب و تمدن کے بیان میں بے حد مبالغے سے کام لیا، یہاں تک کہا گیا کہ ایرانی حضرت اسحٰقؑ کی نسل سے ہیں اس لئے وہ عربوں سے افضل ہیں کیونکہ حضرت اسحٰقؑ کی والدہ ماجدہ حضرت سارہ آزاد خاتون تھیں جبکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ باندی تھیں[2]، حضرت سلمان فارسی رضؓ سے متعلق موضوع احادیث اور روایات کا انبار لگا دیا گیا اور

---

[1] جاحظ کی البیان والتبیین میں باب العصا کے تحت عربوں کے خصائص پر عجمیوں کی پھبتیاں بیان کی گئی ہیں۔
[2] رسائل البلغاء، صفحہ ۲۶۵

انہیں پوری ایرانی قوم کا نمائندہ بتایا گیا اور اس سلسلہ میں جذبات اور میلانات کو پوری چھوٹ دے دی گئی۔ حدیث اور تفسیر میں بھی لوگوں نے کوئی موقع تعصب کے اظہار کا ہاتھ سے نہیں جانے دیا، اور اس معاملہ میں عربوں نے عجمیوں سے اور عجمیوں نے عربوں سے آگے نکل جانے کی کوشش کی، اس بارے میں اگر تیسیر الوصول اور ابن عابدین اور اس کے حاشیے کا مطالعہ کیا جائے تو معاملات کی کئی گرہیں کھل جاتی ہیں اور عرب عجم نزاع کی خوفناک شکل سامنے آجاتی ہے۔ اسی نہج پر ہمیں فقہ میں بھی شعوبی اثرات دکھائی دیتے ہیں، فتاویٰ قاضی خاں میں باب النکاح کے تحت کفاء پر اور ابن عابدین (جلد ۲ صفحہ ۴۹۸) میں عرب اور عجم کے کفو ہونے یا نہ ہونے میں جو بحثیں کی گئی ہیں ان سے شعوبیت کی کارفرمائی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلے دور میں موالیوں یا دوسرے لفظوں میں غیر عرب عناصر نے علم و فن کو بڑی ترقی بخشی، خاص طور سے علوم اسلامیہ کو مدون کیا اور اس سے مسلم معاشرہ کو بہت فائدہ پہونچا، عباسی دور میں جبکہ ہر اس چیز کی عظمت جو عرب تسمی مسلّم ہو چکی تھی، انھوں نے ہر ایسی چیز یا میلان پر تنقید کی اور عقیدہ سے زیادہ عقل کو معیار قرار دیا، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مسلم معاشرہ میں ذہنی غلامی کا پورا پورا استحکام نہ ہو سکا، اور ایک طبقہ ایسا تھا جو معروضیت کو جیسی کچھ کہ معروضیت اس عہد میں ممکن تھی، اہمیت دیتا تھا، لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو عربوں سے عناد کے سبب سخاوت اور فیاضی کی بھی برائی کرتے تھے اور دوسرے معاملوں میں بھی بے حد غلو سے کام لیتے تھے، یہاں تک کہ ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا جسے اسلام میں بھی اس کے عربی نژاد ہونے کے سبب خامی اور کمزوری نظر آنے لگی، اس گروہ نے نہ صرف اس کی آرزو اور کوشش کی کہ ایرانی تہذیب و تمدن اور ایرانی حکومت دوبارہ قائم ہو جائے بلکہ وہ ایرانی مذاہب کے احیار کے خواب بھی دیکھنے لگے، عباسی دور میں ہم زندقہ کو زور پکڑتا ہوا دیکھتے ہیں، اس کے پیچھے اسی طرح کے عناصر و عوامل کارفرما تھے، لیکن اس طرح کی کوششوں کا اثر الٹا ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ تحریک کمزور ہوتی گئی کیونکہ عوام الناس میں اس تحریک کے حامیوں کو اسلام سے بیزار لوگوں میں شمار کیا جانے لگا عوام میں اسلام کی تعلیمات بیحد مقبول تھیں، آرتھوڈوکسی کا مزاج ایسا تھا کہ اس سے عام مسلمانوں کے مذہبی رجحانات کی تسکین ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام

کے سادہ اصول خود اپنے اندر کشش رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے مقابلے میں شعوبیوں کی مبالغہ آمیزیاں کہاں ٹھہر سکتی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریک کے متشدد علماء اور مصنفوں کو دشمن اسلام تصور کیا گیا اور ان کی کتابیں اس طرح ضائع ہوگئیں کہ آج ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔

سعید انصاری

رفتارِ تعلیم

سائنس یا مذہب نہیں سائنس اور مذہب :

اب تک عام لوگوں کے سامنے عام طور پر اور ہماری تعلیم کے سامنے خاص طور پر یہ مسئلہ رہا ہے کہ زندگی کا مقصد یا تو سائنس اور اس کی مادی تعشیات اور برکات کا حصول ہو سکتا ہے، یا پھر مذہب اور اس کا وعدۂ فردا ہو سکتا ہے ۔ اقبال نے اسی تصور کو پیش نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ سے یہ شکایت کی تھی :

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور   اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اور سچ پوچھئے تو گزشتہ صدی میں یورپ کی مادی ترقیوں نے اس فرق کو اتنا واضح کر دیا تھا کہ سائنس اور مذہب میں ایک طرح کا تصادم سمجھا جانے لگا تھا اور سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ ہماری تعلیم کے نزدیک بھی یا تو سائنس کا خیال مقدم سمجھا جانے لگا تھا، یا پھر مذہب پیش نظر ہوتا تھا، اور اسی بنیاد پر تعلیم میں قدیم اور جدید کی ایک آہنی دیوار قائم ہو گئی ہے ۔ لیکن صدر جمہوریہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے "بھارتیہ ودیا بھون" کی تیسری دہ سالہ تقریب کے موقع پر مدتوں کی اس کشمکش کے مقابلہ میں سائنس اور مذہب میں ہمارے دو گروہ کے علماء نے پیدا کر رکھی ہے جب یہ اعلان کیا کہ ہمیں سائنس اور مذہب دونوں کو بہ یک وقت رکھنا ہے تاکہ "انسان کی خارجی دنیا کی فتوحات کے ساتھ ساتھ اسے اپنے نفس پر وہی ضبط اور قدرت حاصل ہو"، تو لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔ آپ نے فرمایا کہ "موجودہ سائنس کوئی ۳۰۰ برس سے پیدا ہوئی ہے اور اس وقت سے

اس نے اس قدر تیزی سے قدم بڑھایا ہے کہ انسان کی مادی فلاح و بہبود میں بہت کچھ اضافہ کر دیا ہے اور اسی کے ساتھ اس میں ہوا و ہوس اتنی پیدا کر دی کہ انسان نے مذہب کو تھوڑی دیر کے لیۓ اٹھا کر کنارے ڈال دیا۔ مغرب کی مادی ترقیوں نے ہمیں مذہب کی طرف سے ایسا غافل کر دیا کہ ہم مذہب اور روحانی زندگی کی ضرورت سے بھی انکار کرنے لگے۔ بڑی قربانی کے بعد آج انسان یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ سائینس اور ٹکنالوجی کی بدولت ہماری مادی ترقیاں ضرر سے خالی نہیں رہی ہیں۔ جس مسرت و خوشی کا وہ خواب دیکھ رہا تھا، اسے اب وہ سراب نظر آنے لگی۔ صدر جمہوریہ نے بتایا کہ اس کا بس ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ جب تک ہم اس پر زور دیتے رہیں گے کہ یا تو سائینس رہے یا مذہب، اس وقت تک ہم حقیقی مسرت سے دوچار نہ ہوں گے۔ ہمیں دونوں کو ملانا ہے اور دونوں کو ساتھ لے کر چلنا ہے تاکہ انسان کی بیرونی فتوحات کے ساتھ ساتھ اندرونی زندگی کی کامیابی اور تکمیل بھی ہو۔ جس وقت انسان خدا کا بھی قایل ہوگا، اپنے نفس کی حقیقتوں کو بھی پہچان لے گا، اور اپنے اندر کی تخلیقی قوتوں کو بروۓ کار لا سکے گا، اس وقت اسے بیرونی اور اندرونی دونوں طور پر امن اور مسرت حاصل ہوگی۔

'اسٹیٹسمین' نے اس خیال کو 'ایک نئے نعرے' سے تعبیر کیا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ اس تصور کا مبلغ، آج سے نہیں بلکہ نصف صدی سے عملاً اس خیال کی اشاعت و تکمیل کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین آج صدر جمہوریہ نہیں بلکہ اب سے تقریباً ۵۰ برس پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کرتا دھرتا بھی تھے جو اسی اصول پر قائم ہوئی تھی، جس میں قدیم و جدید تعلیم کے فرق کو مٹانے کی کوشش کی گئی۔ جس کی تعلیم یہ تھی:

دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر شود

اور جس کا نعرہ اپنے طلبا کے لیۓ یہ تھا کہ

از کلید دین درِ دنیا کشاد

پھر اس کے لیۓ آج اس کی تلقین کہ 'سائینس یا مذہب' نہیں بلکہ 'سائینس اور مذہب' کوئی نیا نعرہ نہیں ہے۔

این۔سی۔سی: اس کا ماضی اور حال:

اب سے کوئی ۲۰ برس پہلے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ہماری فوجوں میں جو نوجوان داخل ہونے کے لیۓ

آتے ہیں ان میں خود اعتمادی اور احساس ذمہ داری کی بڑی کمی ہوتی ہے، اور اوصاف اعلیٰ فوجی ذمہ داریوں کے لئے نہ تو ازخود پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ ایک عمر کے بعد ان میں پیدا کئے جا سکتے ہیں، اس لئے این این سی جیسی تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی جو ان نوجوانوں کی طالب علمی کے زمانہ سے شروع کی جائے اور ان میں اعلیٰ سیرت کے اوصاف اور ملکی خدمت کے جذبات بھی پیدا کئے جائیں، علاوہ اس کے کہ ان کی جسمانی تربیت اور فوجی نظم ونسق کی تعلیم ہو۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں این۔ سی۔ سی ایکٹ کے نام سے ایک قانون پاس ہوا اور یہ تنظیم باقاعدہ طور پر وجود میں آئی اور اس کی بنیاد پر ۳۸۰۳۰۵ جوانوں کی اور ۱۱۰۰۰ افسروں کی بھرتی عمل میں آئی۔

شروع شروع میں جو نوجوان بھرتی ہوئے، وہ کچھ اور ہی انداز کے تھے: ان میں کام کا شوق اور ایک "نئے ہندوستان" کی تعمیر کا جذبہ بھی تھا۔ ۱۹۶۰ء تک ہندوستان کے اسکولوں اور کالجوں میں جو نوجوان اس میں بھرتی ہوئے، ان کی تعداد ۲۰۳۵۰۸۱۴ تک پہنچ گئی اور اسی نسبت سے ان کی تربیت دینے والوں کی تعداد ۲۰۳۴۶۰۵ کے قریب تھی۔ لیکن چینی حملہ کے بعد سے جب سے یہ لازم قرار دی گئی اس کی نوعیت بدل گئی اور نہ یہ نوجوانوں کے لئے اس قدر کشش اور عزت کا باعث رہی، جیسی کہ یہ پہلے تھی۔

ہندوستان کا تو ہر مسئلہ کثرت تعداد کا مسئلہ ہے اور اسی کی وجہ سے دوسرے مسایل پیدا ہوتے ہیں۔ اس تنظیم کے لازم اور جبری کرنے کے بعد ۵۰۰۰۰۰ نوجوانوں کی مزید تعداد کو فوراً بھرتی کرنا پڑا جن کے لئے اسی اعتبار سے ٹرننگ دینے والوں اور اسی قدر سامان اور وسایل کی ضرورت پڑی، مثلاً ایک یونیفارم کے لئے ۹۰ لاکھ میٹر کپڑوں کی ضرورت پڑی اور ۸ لاکھ جوڑے جوتوں کی۔ یونیورسٹی حلقوں میں ڈاکٹر سی۔ پی راماسوامی آیر جیسے لوگ بھی تھے جو یونیورسٹی میں اس کے لازم اور جبری رکھے جانے پر مصر تھے۔ لیکن جو باتیں عملاً پیش آتی رہیں، وہ ان کے افسروں اور ٹرننگ دینے والوں سے پوچھئے۔ ایک انسٹرکٹر کہتا ہے کہ "جو طلبا پریڈ کے لئے جبراً او قہراً آتے تھے، وہ ہماری زندگی دو بھر کر ڈالتے تھے"۔ بعض انسٹرکٹر آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے میدان سے لوٹتے تھے، اس لئے کہ یہ نوجوان ان کا ناطقہ تنگ کر ڈالتے تھے، کہیں ان کی ٹوپیاں چھپا دیتے، کہیں اور طرح پریشان کرتے۔ غرض فوجی تعلیم وتربیت

جو ایک وقار اور نظم وضبط کا کام سمجھا جاتا تھا، وہ ان کے ہاتھوں بچوں کا کھیل بن گیا۔
اس کا علاج ایک تو یہ ہو سکتا تھا کہ فوجی قواعد کے مطابق ان پر سختی ہوتی اور ہر غلطی اور بے قاعدگی پر سخت سزائیں دی جاتیں۔ لیکن یہ معاملہ یونیورسٹی کا ٹھہرا۔ جب ان پر سختی اور سزا کا سوال پیش آتا تو پرنسپل اور وائس چانسلر کانوں پر ہاتھ دھرتے کہ یہ تعلیمی آداب کے خلاف ہے اور اگر سزا دی گئی تو معاملہ عدالت تک پہنچ جائے گا۔ اس ردعمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ این۔ سی۔ سی کا ڈسپلن اور ضبط روز بہ روز خراب ہوتا گیا اور تنظیم بہت کمزور اور سست پڑگئی، حتیٰ کہ گزشتہ سال سے اسے اختیاری کر دیا گیا، لیکن پھر بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا اور طلبا نے اسے اپنی ایک فتح سمجھی۔ اس سال سے وزارت تعلیم نے اس کی بجائے دو اور تنظیمیں شروع کی ہیں: ایک 'نیشنل سروس کور' کے نام سے اور دوسری 'نیشنل اسپورٹس آرگنائزیشن' کے نام سے، تاکہ جن طلبا کو این۔ سی۔ سی سے دلچسپی نہ ہو، وہ ان میں سے کسی میں اپنی خواہش کے مطابق شریک ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ طلبا اور یونیورسٹیوں کے حالات پر منحصر ہے کہ ان میں بھی کہاں تک کامیابی ہوتی ہے۔ اس وقت جبکہ این۔ سی۔ سی اختیاری رہ گئی ہے، اس کے کل شرکا کی تعداد ۰۰۰ء۰۰ء۱۲ ہے جو میں سے ۰۰۰ء۰۰ء۶ جونیر حصہ میں ہیں اور ۰۰۰ء۰۰ء۶ سینیر حصہ میں۔ ان پر اس وقت حکومت کا جو خرچ آتا ہے، وہ ۱۵۰ روپیہ فی کس کے حساب سے کل ۱۸ کروڑ سالانہ کا خرچ ہے۔ لیکن دیکھنا ہے کہ حکومت یہ خرچ کب تک برداشت کرتی ہے، اور آیا جو فایدہ اس سے حاصل ہے، وہ اس خرچ کا مستحق بھی ہے؟

کوائف جامعہ

غالب صد سالہ برسی کا جامعہ میں آغاز

ماہنامہ جامعہ کے اکتوبر کے شمارے میں، غالب صد سالہ برسی کی تیاریوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ تیاری کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، مگر اسی کے ساتھ پروگرام کے مطابق مختلف تقریبوں اور جلسوں کا آغاز بھی کر دیا گیا ہے۔ ۱۹ دسمبر کو کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ایس این سین صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور شہر کے معززین نے شرکت کی۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے غالب کی تصویر پیش کرتے وقت انگریزی میں جو تقریر کی تھی، اس کا ترجمہ ذیل میں شائع کیا جاتا ہے:

اردو کے مشہور شاعر اسد اللہ خاں غالب کی تصویر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں۔ یہ تصویر جامعہ کے ایک استاد نریندر کمار ڈکشٹ کے خلوص اور محبت کا نتیجہ ہے۔

غالب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں بسر کیا، لیکن انھوں نے چند سفر بھی کئے ہیں، وہ بنارس اور کلکتہ تشریف لائے اور ان دونوں کی تعریف و توصیف میں مثنویاں کہیں۔ کلکتہ کی صنعتی ترقی سے وہ بے حد متاثر ہوئے، اگرچہ وہ اپنی شاعری میں قدیم روایات کی پابندی کا لحاظ رکھتے تھے، لیکن کلکتہ کے دوران قیام میں انھیں جدید تقاضوں کی اہمیت کا احساس پیدا ہوا اور سائنسی ترقی کو پسند فرمایا اور اسے اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ان کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر اپنے وطن کی غلامی پر انھیں سخت تکلیف تھی، چنانچہ ۱۸۵۷ء سے قبل انھوں نے اپنے ان جذبات کا ایک غزل میں اظہار کیا ہے:

جز دل سراغِ صد بیل خفتگاں نہ پوچھ	آئینہ عرض کر، خط و خالِ بیاں نہ پوچھ
ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا	جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ
پروانہ یک بتِ غمِ تسخیرِ نالہ ہے	گرمیِ نبضِ خار و خسِ آشیاں نہ پوچھ
تو مشقِ ناز کر، دلِ پروانہ ہے بہار	بیتابیِ تجلیِ آتش بجاں نہ پوچھ
غفلت متاعِ کفۂ میزان عدل ہوں	یارب، حسابِ سختیِ خوابِ گراں نہ پوچھ

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے　　عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ آہ

دردِ جدائی اسدؔ اللہ خاں نہ پوچھ

غالبؔ کے کلام میں وہ تمام جذبات ملتے ہیں، جو ہندوستانی نظریۂ حیات کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ وہ اخوتِ انسانی کے قائل اور حامی تھے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بندہ پرور، میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں، دوسرا مانے یا نہ مانے۔"

یہ وقتی اور عارضی جذبہ نہیں تھا، زندگی بھر دوسروں کے لئے فکرمند رہے اور طبیعت کی فیاضی اور دریا دلی کی وجہ سے ہمیشہ تنگی ترشی کی زندگی بسر کی، پھر بھی وہ مطمئن نہ تھے۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی۔ جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔"

ایسا شخص قدرتی طور پر اس چیز کے خلاف ہوگا جو نوعِ انسان کو تقسیم کرے یا ایک انسان کو دوسرے انسان کا غلام بنائے۔ غالبؔ ایسے مذہب کا سختی کے ساتھ انکار کرتے ہیں جو وصل کے بجائے فصل کا باعث ہو:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

بہرحال وہ کسی مخصوص مذہب پر تنقید کرنے سے احتراز کرتے تھے، انکار اور تردید سے زیادہ انھیں انسان کی خود آگہی اور اس خود آگہی کے بلند سے بلند اسالیب اظہار کی فکر تھی۔ اپنی ایک حمد میں اپنے مخصوص مذہبی احساسات کا اظہار کیا ہے، جس میں انتہائی خوبصورتی کے ساتھ الوہی بلندیوں کو اپنے احساس کے قرب سے ہم آمیز کیا ہے۔ ساتھ ہی اس حمد میں زیرِ لب شکوہ سنجی اور تمنا کا بہترین امتزاج بھی ہے:

نیاز، پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے　　جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے، آستاں تجھ سے

بہانۂ جوئی رحمت، کمیں گرِ تقریب　　وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے

اسدؔ طلسمِ قفس میں رہے، قیامت ہے　　خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

غالبؔ اپنے عہد سے آگے تھے۔ ان کی بصارت اور بصیرت ان کے ماحول اور زمانے اور ان کے سماج کے خیالات و تصورات سے کہیں آگے تھی۔ انھوں نے انفرادی واقعات کے بجائے انسان اور اس کے وجود کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، ان کا درد پوری انسانیت کا درد تھا۔

وہ آگہی کو انسانی رنج و غم کا سرچشمہ سمجھتے ہیں لیکن آگہی کا ان کا تصور بہت وسیع ہے اور وہ

کسی مخصوص برائی یا بے انصافی کے احساس تک محدود نہیں ہے۔ اُن کا درد وہ عام انسانی درد ہے جو ایک حساس انسانی دماغ محسوس کرتا ہے اور اس کا تقاضہ ہے کہ خدا اور خود انسان کے پیدا کردہ حالات زندگی کو ایک مستقل عذاب اور اذیت کے بجائے دوستی اور فراخ دلی کا مظہر ہونا چاہیئے لیکن غالب صرف اتنے سے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ وہ اس مطلق اور نا قابلِ تحصیل آزادی کے بھی آرزومند ہیں جو زمان و مکان کے قیود سے ماورا ہے

ملی نہ فرصتِ جولانِ یک جنوں ہم کو
عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا

یہ "دیوانگی" ہے اور غالب اسے دیوانگی سمجھتے بھی ہیں۔

پہن گشتہائے دل، بزمِ نشاط گرد باد
لذتِ عرض کشا دعقدۂ مشکل نہ پوچھ

لیکن یہ دیوانگی صرف انسان تک محدود نہیں ہے۔ یہ دیوانگی وہ ہے جو کائنات کے ہر ذرے میں سرایت کرگئی حتیٰ کہ اس خاک میں بھی جس میں آدمی دفن ہوتا ہے اور جہاں پہنچکر بھی وہ فنا کی مسرت سے محروم رہتا ہے

طلسم خاک کمیں گاہ یک جہاں سودا
بہ مرگ تکیۂ آسائش فنا، معلوم

بلا خر انھیں اس دردِ محرومی کا درماں انتہائی یاس اور محرومی میں ملتا ہے۔

غالب اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں کچھ زیادہ استقلال کے ساتھ عام جذبات اور عام اسلوب سے گریز کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ صرف شاعروں کے لئے شعر کہتے ہیں یا جنھیں خود انھیں جیسا بے پناہ تخیل ودیعت ہوا ہو۔ انھوں نے خود اپنی فرہنگ تخلیق کی اور نئے پیرایۂ بیان نکالے۔ انھوں نے یہ خطرہ مول لیا کہ وہ پہاڑ کی سر بفلک چوٹی کی طرح عام انسانوں سے دور رہیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ نقاب سرکنے لگی۔ پہاڑ کی چوٹی سے برف پگھلی اور پانی جنگلوں اور سبزہ زاروں کو سیراب کرتا ہوا میدانوں میں بہنے لگا اور ساری فضا چشموں کے نغمۂ رفتار سے معمور ہو گئی، یہاں تک کہ پہاڑ اپنی پوری عظمت کے ساتھ جنتِ نگاہ ہونے لگا۔ لیکن اس جلوہ گری سے خود پہاڑ کی بلندی میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ اس کی عظمت اداس کا شکوہ زیادہ واضح ہو جاتا ہے اور اُس تک زیادہ لوگوں کی دسترس ہو جاتی ہے۔ غالب عوام کے شاعر بن گئے۔ جس نے بھی ان کے شعر سنے یا پڑھے اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ غالب خود ان کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے اور ان کے لئے فریب و حقائق کا ایک عالم تعمیر کر رہا ہے۔ چنانچہ عوام نے بڑے خلوص کے ساتھ غالب کو اپنایا اور جو مقبولیت غالب کو حاصل ہوئی وہ اس زمانے

کے یا اُس سے پہلے کے کسی بھی شاعر کو نہیں نصیب ہوئی ۔ ہر آنے والی نسل نے انھیں زیادہ جوش وخروش کے ساتھ سراہا اور توصیف کے نئے نئے جواز نکالے نتیجہ یہ ہے کہ غالب ایک عوامی شاعر کی سطح سے اٹھکر اب ایک عالمی اور سب انسانوں کے شاعر کی بلندی پر پہنچ رہے ہیں ۔

جناب وائس چانسلر صاحب ! میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اگر آپ غالب کی سو سالہ برسی اور کلچے سے جس تعلق اور پسندیدگی کا انھوں نے اظہار کیا ہے، اس کے پیش نظر ان کی یہ تصویر قبول فرمائیں۔"

مختلف یونیورسٹی کو پیش کرنے کے لئے جامعہ کے آرٹسٹوں نے جو تصاویر بنائی ہیں، ان میں تین تصویریں جامعہ کے ایک قدیم طالب علم اور کالج کے استاد جناب عبید الحق صاحب کی بنائی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک تصویر جامعہ کالج میں لگائی تھی ۔ امیر جامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (صدر جمہوریہ) حسب معمول نماز عید ادا کرنے کے لئے ۲۲ دسمبر کو جب جامعہ تشریف لائے، تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے موصوف سے غالب کی اس تصویر کی نقاب کشائی کے لئے درخواست کی، جسے انھوں نے خوشی سے منظور فرمایا۔ نقاب کشائی کی رسم ادا کرنے کے بعد، موصوف کافی دیر تک جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں سے، جو اس موقع پر موجود تھے، علمی وادبی مسائل پر گفتگو فرماتے رہے ۔

غالب صدی کے سلسلے میں جامعہ کے پروگرام کا ذکر کرتے وقت ہم نے لکھا تھا کہ شیخ الجامعہ صاحب کی تجویز اور خواہش ہے کہ ان اسکولوں اور شہروں میں، جہاں لوگ عام طور پر غالب سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، جلسوں اور نمائشوں وغیرہ کے ذریعہ غالب کا تعارف کرایا جائے ۔ اس پروگرام کے تحت مدرسہ ثانوی کے اہتمام میں دہلی کے مختلف اسکولوں میں جلسے کئے گئے اور جامعہ کے طلبہ نے، جن میں زیادہ تر مدرسہ ثانوی کے تھے، غالب کی آسان اور عام فہم غزلیں ترنم سے پڑھکر سنائیں، ان مواقع پر مختصر نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا جس میں اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں چارٹوں اور مضمونوں کے ذریعہ غالب کی زندگی اور شاعری پر روشنی ڈالی گئی تھی ۔ یہ جلسے اور نمائشیں بہت کامیاب ہوئیں اور ان کو بہت پسند کیا گیا۔ جن اسکولوں میں یہ انتظامات کئے گئے تھے، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) سینٹ تھامس اسکول (۲) سالوان پبلک اسکول (۳) اسپرنگ ڈیلز اسکول (۴) دہلی پبلک اسکول (۵) بیسک ٹریننگ اسکول دریا گنج ۔

(عبد اللطیف اعظمی)

اساتذۂ جامعہ کی تازہ مطبوعات

جامعہ ملیہ کے چند اساتذہ کی ابھی حال میں کچھ کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان کی تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں :

ہفت تماشا :

مولفہ : مرزا محمد حسن قتیل
مترجمہ : ڈاکٹر محمد عمر

یہ کتاب اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کے ہندوستانی معاشرت پر مبسوط اور اہم ماخذ

کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولف کا تعارف اس کتاب کے پیش لفظ میں جناب مالک رام صاحب نے یوں کرایا ہے:

"قتیل ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کا بچپن اور نوجوانی کا ابتدائی زمانہ اسی ماحول میں بسر ہوا۔ عین عنفوانِ شباب یعنی سترہ برس کی عمر میں انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اس طرح وہ گویا ہندو اور اسلامی تہذیب کا سنگم بن گئے۔ ان کے علم اور مشاہدے اور غور و فکر کا مرقع ان کی یہ کتاب "ہفت تماشا" ہے۔"

بقول مالک رام صاحب "چونکہ فارسی کا رواج کم ہو رہا ہے، اس لیے علمی حلقوں کو مترجم کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے ایسی اہم کتاب کے مطالب کو ان کے لیے شگفتہ اور رواں دواں اردو میں سہل الحصول بنا دیا۔"

اپریل ۱۹۶۸ء میں کتاب چھپی ہے، ۲۶ × ۲۰ سائز پر ۱۹۶ صفحات ہیں، قیمت مجلد مع گرد پوش سات روپے۔ غیر مجلد چھ روپے۔ ناشر: مکتبہ برہان۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

شرابِ کہنہ   از رشید نعمانی

جناب رشید نعمانی صاحب "کتاب نما" میں اردو شاعروں پر مختصر تعارفی مضمون لکھا کرتے تھے، یہ کتاب انھیں مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں قلی قطب شاہ سے حالی تک پچاس شاعروں کا مختصر تذکرہ اور ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ فاضل تذکرہ نگار نے لکھا ہے کہ "اس کے لکھنے میں جن باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا وہ یہ ہیں: (۱) حالات مختصر ہوں اور مستند (۲) اشعار عام فہم ہوں اور عام پسند (۳) کلام سے شاعر کے رنگ اور رجحان کا بھی اندازہ ہو سکے (۴) ولادت اور وفات دونوں لازمی طور پر سنہ عیسوی میں ہوں۔"

اس کتاب کا پیش لفظ بھی جناب مالک رام صاحب کے قلم سے ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "وہ (نعمانی صاحب) دعویٰ نہیں کرتے کہ انھوں نے کوئی نئی بات دریافت کی ہے، لیکن یہی کیا کم ہے کہ اتنے سارے اساتذہ کے صحیح حالات اور اچھے کلام ایک جگہ جمع کر دئے گئے ہیں۔"

کتابی سائز پر ۲۳۲ صفحات ہیں۔ تاریخ طباعت: فروری ۱۹۶۸ء۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

عکس و شخص   از عنوان چشتی

پیش نظر کتاب جناب عنوان چشتی صاحب کے مضامین کا اولین مجموعہ ہے، جس میں اردو کے شاعروں اور نثر نگاروں کی زندگی اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کا تذکرہ ہے۔ عنوان صاحب نے ان مضامین کے بارے میں لکھا ہے "ہم عصر ادیبوں اور شاعروں پر لکھنا کئی طرح کی آزمائش سے گزرنا ہے

۔۔ بہت سے خطرے مول لیکر قلم اٹھایا ہے اور اس اعتماد کے ساتھ اٹھایا ہے کہ اگر آزادیٔ تحریر ادیب کا ح ہے اور وہ اپنی مخلصانہ رائے کے اظہار کو ضروری سمجھتا ہے تو اس کو اپنے مافی الضمیر کا اظہار ضرور کرنا چاہیٔ

کتابی سائز، حجم ۱۴۸ صفحات، تاریخ طباعت: جون ۱۹۶۸ء، قیمت مجلد مع گرد پوش : پانچ روپے

ناشر: مکتبۂ عارض ۔ ۲۸۲ ۳، مادی پور ۔ دہلی ۳۶

چلم نامہ از محمد یوسف پاپا

پیش نظر کتاب چند طنزیہ و مزاحیہ نظموں پر مشتمل ہے، جو اپنے انداز اور اسلوب کے لحاظ سے کسی قدر ندرت کی حامل ہیں۔ اس کا تعارف اردو کے مزاحیہ نگار شاعر اور ادیب جناب غلام احمد فرقت صاحب کے قلم کا رہین منت ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "یہ چلم نامہ حقیقتاً ان لوگوں پر ایک گہرا طنز ہے جو کسی قسم کی صلاحیت کے حامل نہ ہوتے ہوئے بھی بڑے بڑے عہدے محض خوشامد درآمد اور رحیٹر سے حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کے چلم نامے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنے بلند پایہ طنز نگار بھی ہیں اور کتنا عمیق مشاہ قدرت نے اس شخص کو دیا ہے۔"

جگہ کی تنگی کی وجہ سے یہاں نظموں کا انتخاب پیش کرنا ممکن نہیں، صرف ایک شعر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

چلم نامہ تو ہمت کر کے لکھنے جا رہا ہوں میں
مگر بر ہم چلم بردار سے گھبرا رہا ہوں میں

نیّر صاحب کی نظمیں اور کہانیاں

جناب محمد شفیع الدین نیّر صاحب بچوں کے مشہور شاعر اور ادیب ہیں اور انھوں نے بچوں کیلیٔ کہانیوں کی مختصر کتابیں بھی لکھی ہیں جو ان کی نظموں کی طرح بہت مقبول ہوئی ہیں۔ ابھی حال میں ان کی حسب ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں:

(۱) اسلامی نظمیں (ساتواں ایڈیشن ۱۹۶۸ء) قیمت ۶۵ پیسے
(۲) وطنی نظمیں (تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۸ء) قیمت ۸۵ پیسے
(۳) گھر کا آئینہ (کہانی ۔ نئی کتاب) قیمت ۳۵ پیسے
(۴) عید کے کھلونے (" ") " "
(۵) یادگار انگوٹھی (" ") " "

ناشر: نیّر کتاب گھر ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

(عبد اللطیف اعظمی)

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۵۹	بابت ماہ اپریل ۱۹۶۹ء	شمارہ ۴

فہرست مضامین

مدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ :

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون :

ایڈیٹر: ۷۴۲۵۸　　مینجر: ۷۴۴۷۰

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

۲۲ مارچ کو دہلی کلاتھ ملز والوں کی طرف سے بزمِ شنکر و شاد کے عنوان سے وہ سالانہ مشاعرہ ہوا جو انڈو پاک مشاعرہ کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن ادھر کئی سال سے پاکستان نے سیاست گری کی دیوار اتنی اونچی کر رکھی ہے کہ پاکستانی شعراء، خواہش اور کوشش کے باوجود اسے پار نہیں کر پاتے۔ چنانچہ اس بار بھی یہ محفل ان شعراء سے خالی رہی۔ اس موقع پر اس مشاعرے کے ذکر کے دو سبب ہیں، ایک یہ کہ اس میں میں نے فراق گورکھپوری کو ایک خاص کیفیت میں دیکھا، سب جانتے ہیں کہ فراق کا شعر پڑھنے کا اپنا ایک انداز ہے، وہ انداز باوجود علالت اور ناتوانی کے باقی ہے بلکہ اب اس میں اور بھی خستگی اور برشتگی پیدا ہوگئی ہے، انھوں نے اپنے اسی مخصوص انداز میں متفرق اشعار سنائے اور کم و بیش ہر شعر کے نازل ہونے کا موقع و محل بیان کیا، ایک شعر ایسا سنایا جس کا خیال ایک انگریزی نظم کی دو لائنوں سے ماخوذ تھا اور یہ کہہ کر سنایا کہ جب میں نے یہ لائنیں پڑھیں اور اُن سے متاثر ہوا تو مجھے خیال آیا کہ اس خیال کو چرانا چاہیے، معلوم نہیں کہ لوگ میری اس بات سے اتفاق کریں گے یا نہیں کہ شاعر اگر اپنے اشعار کے حالاتِ نزول پس منظر کے طور پر بیان کرے اور پھر شعر پڑھے تو شعر کا معنوی حُسن نکھر کر سامنے آجاتا ہے، فراق جب اپنی اس خاص کیفیت میں ہوتے ہیں تو یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ کوئی خاص لفظ یا محاورہ انھوں نے کیوں استعمال کیا ہے اور اس سے شعر میں معنی و صورت کے اعتبار سے کیا حُسن پیدا ہوگیا ہے۔ دوسرے شاعروں کے مقابلہ میں فراق کو یہ تفوق حاصل ہے کہ وہ انگریزی اور اردو ادب کے اچھے عالم اور لفظوں اور محاوروں کے مزاج شناس ہیں اور اسی لئے

شعر کے نزول کا پس منظر بیان کرنے کے سلسلے میں اُن کی جو تمہیدی تقریر ہوتی ہے وہ بذاتِ خود ایک ادبی لکچر بن جاتا ہے جو دلچسپ بھی ہوتا ہے اور مفید بھی۔ کیا اچھا ہو کہ قیدِ حیات سے رہا ہونے سے پہلے وہ اپنے ایسے اشعار کی تاریخ مرتب کر جائیں جن کے پیچھے قلبی واردات اور فنی ریاضت کی رنگین، دلچسپ اور زبان و ادب کے طالب علموں کے لئے مفید داستانیں ہیں۔

دوسرا سبب اس مشاعرہ کے ذکر کا یہ ہے کہ اس میں سردار جعفری نے غالب کی زمین میں کہی ہوئی اپنی ایک پرانی غزل سنائی، اس تمہید کے ساتھ کہ آخر کے چار شعر نئے ہیں، ان شعروں میں سردار نے اشارۃً بڑی خوبصورتی سے یہ کہا ہے کہ غالب کی زبان یعنی اُردو دلی کی آبرو بن کر رہی ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ آبرو آنکھ سے ٹپکے ہوئے لہو کی ایک بوند بن کر رہ جائے، ایک اور شاعر نے کسی کنایے کے بغیر، خالص نثری لہجے میں، صاف صاف یہ کہہ دیا کہ اگر اردو کوئی زبان نہیں ہے تو یہاں اتنے لوگ کیوں جمع ہوئے ہیں؟ ان باتوں سے ذہن ہندوستان ٹائمز کے اُس اداریے کی طرف منتقل ہوا جس کا عنوان "غالب کی زبان" تھا اور جو اُس وقت لکھا گیا تھا جب دہلی میں جشنِ غالب کی تقریبات ہو رہی تھیں۔ اس اداریے کے چند ٹکڑے جس کا ترجمہ ۵ ؍مارچ ۶۹ء کے "ہماری زبان" میں شائع ہوا ہے، درج ذیل ہیں۔

"آج ... جبکہ ہمارا پورا ملک اور دنیا کے بیشتر ممالک غالب کی یاد منا رہے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس غالب صدی میں کس چیز کا جشن منا رہے ہیں؟ کیا یہ اسد اللہ خاں کا جشن ہے؟ یا اس کی غیر فانی شاعری کا جشن ہے، جشن کا مقصد یہی ہے یا کچھ اور ہے؟ کیا ہم غالب کو اس زبان سے علاحدہ کر کے یاد کر سکتے ہیں جس میں اُس نے اپنی تخلیقات پیش کیں؟ کیا ہم جب غالب کو یاد کرتے ہیں تو اردو کو تسلیم نہیں کرتے؟ اور ایسا کرتے ہوئے کیا ہم ان تہذیبی روایات اور ورثہ کی نشاندہی نہیں کرتے جو ہندوستانی تہذیب کا ایک اہم جزو ہے ...

"غالب صدی کا آغاز ابھی ابھی ہوا ہے اور ہمیں اس زبان کی طرف بھی توجہ دینی پڑے گی جس کو غالب نے وسیلۂ اظہار بنایا تھا اور جو دو دہائی پہلے ایک جیتی جاگتی اور ترقی یافتہ لوگوں کی زبان تھی اور جو آج ماضی کی یادگار بنائی جارہی ہے، اور اگر ایسا ہی ہوتا رہا تو اس زبان سے ہماری نسل ناواقف ہوگی اور تین چار سو طلبہ علمی خانقاہوں میں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کریں گے۔ یہاں یہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ اگر اردو کی حیثیت ختم کردی جائے تو کیا ہندوستانی تہذیب کا وہ تناور درخت خشک نہ ہو جائے گا جسے اُس نے سینچا تھا...

"اب جبکہ غالب صدی کے اِس سال میں ہم غالب کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں ہمیں یہ غور کرنا چاہیئے کہ اپنے رسم خط اور الفاظ کی بدولت اردو مغربی ایشیا کے ممالک سے بھی رابطہ رکھتی ہے، یہ ممالک ہمارے پڑوسی بھی ہیں، اس کے علاوہ پاکستان بھی ہمارا پڑوسی ہے جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے، اس لئے اردو کے ذریعہ ہم ان ممالک سے زیادہ بہتر، مضبوط اور پائدار رشتہ قائم کرسکتے ہیں۔ ہمارے لئے بہتر ہوگا کہ ہم اردو کو تقویت پہونچائیں۔ بڑی بدنصیبی ہوگی اگر ہندوستان نے اردو کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا اور غالب صدی کے اس سال سے اردو کی ترقی کے لئے راہیں ہموار نہ کیں۔ آخر میں ہم پھر یہ کہیں گے کہ اسے ہم کیسے چھوڑ سکتے ہیں جو ہمارا ہے۔"

اُردو والے ہندوستان ٹائمز کے فاضل اور منصف مزاج ایڈیٹر کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اُس حلقہ میں یہ آواز پہونچائی جہاں اُردو والوں کی آواز نہیں پہونچتی، لیکن اس وقت ہمارا قومی المیہ یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ملک میں معقول اور شریف انسانوں کی کمی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی پر معقول بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا، آخر ایسا کیوں ہے اور اس سے بڑھ کر ہماری بدنصیبی اور کیا ہوسکتی ہے؟ ہندوستان ٹائمز نے جو باتیں کہی ہیں وہ اُردو کے پلیٹ فارم سے گذشتہ بیس سال میں بار بار کہی گئی ہیں، مگر کیا نتیجہ نکلا؟ اور صرف زبان کا معاملہ ہی نہیں، سیاست اور معیشت کا کوئی معاملہ ہو، انصاف اور جمہوری قدروں کی کوئی بات ہو، ظلم و تعدی کے خلاف کوئی آواز ہو،

سب صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے، معقول بات سننے والوں کی کمی نہیں لیکن معقول اور انصاف کی بات پر جم جانے والے اور حقدار کو اس کا حق دلانے والے کہیں نظر نہیں آتے، اس وقت ہمارے قومی بحران کا ایک سبب، ہاں ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔

مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے مذہب اور سیاست کی علاحدگی کے معنی یہ سمجھ لئے ہیں کہ سیاست ہر قسم کے اخلاقی اصول سے عاری ہوگئی ہے۔ مذہب اور سیاست کے الگ الگ ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم اُن اخلاقی قدروں کو خیرباد کہہ دیں جن پر شریفانہ زندگی کی بنیاد ہوتی ہے، اگر ایسا ہوتا تو وہ ممالک جن سے ہم نے یہ سبق سیکھا ہے، ترقی اور خوشحالی کی اُس منزل پر نہ ہوتے جہاں آج ہم انھیں پاتے ہیں، مذہب اور سیاست کی علاحدگی کے اصول کو اپنانے کے بعد تو اخلاقی ذمہ داریوں اور انسانی قدروں کی خدمت گذاری کا بوجھ اور بڑھ جاتا ہے، اِس بنیادی بات کو ہم جس قدر جلد اپنالیں اُسی قدر تیزی سے ہماری ترقی وتعمیر صحیح رُخ اختیار کرے گی۔

پروفیسر محمد مجیب

مہاتما گاندھی

اس سال ہم گاندھی جی کی سو سالہ برسی منا رہے ہیں، اور اس نیک کام میں ہندوستان کے ساتھ ساری دنیا شریک ہوگئی ہے۔ گاندھی جی کی اصل یادگار ان کے اصول ہیں اور وہ خلوص اور ہمت جس کے ساتھ انھوں نے اپنے اصولوں پر عمل کیا۔ ایک کٹھن سوال جو اس وقت پیدا ہوگیا ہے یہ ہے کہ یہ اصول کہاں تک ہمارے اصول بن سکتے ہیں، اور گاندھی جی نے ان پر عمل کرنے کی جو کوشش کی وہ ایک بیتے کی بات ہے یا ہمارے لئے آج اور اس وقت ایک مثال ہے جس کے مطابق ہم اپنی ذاتی اور قومی زندگی کو ڈھال سکتے ہیں۔ اہنسا کے گن گانا بہت آسان ہے، لیکن اس کے گن گانے کے بعد اس پر عمل کرنے کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اگر ہماری مصلحت اور ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے دشمنوں سے ملک کی حفاظت کرنے کا ہر ممکن انتظام کریں، اور یہ انتظام اہنسا کے ذریعہ نہیں ہو سکتا، ہوائی جہازوں اور ٹینکوں اور جاں باز سپاہیوں کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے تو اہنسا کی اس طرح تعریف کرنا کہ گویا ہماری قومی پالیسی اس کی ایک مثال ہے کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ گاندھی جی اپنی ساری زندگی کو اہنسا کی تشریح، اس کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بنانا چاہتے تھے۔ ہم اہنسا کو نظر انداز کر کے بھی ان کی زندگی کو اہمیت دے سکتے ہیں، اس لئے کہ ان کے ہر منصوبے کی بڑی سیاسی اور سماجی اہمیت تھی۔ لیکن یہ ایسا ہی ہوگا جیسے تمام پھول چن لینے کے بعد باغ کی رنگینی بیان کرنا۔

اس لحاظ سے گاندھی جی کی تقدیر دنیا کے دوسرے رہناؤں سے کچھ الگ نہیں ہے۔ جس مذہب کے پیرووں کو دیکھیے، وہ اپنے مذہب کے اخلاقی اصولوں اور روحانی میلانات کا بیان

اس طرح کرتے ہیں کہ گویا خود انھوں نے سب کچھ حاصل کرلیا ہے۔ دوسری طرف اگر وہ دیانت داری سے کام لیں، اور صاف کہدیں کہ وہ اپنے مذہب کے اعلیٰ اصولوں پر عمل نہیں کر سکتے ہیں تو سمجھا جائے گا کہ جب کسی مذہب کے اصولوں پر خود اس کے ماننے والے عمل نہیں کر سکتے ہیں تو غالبًا یہ ناقابل عمل اور ہمارے لئے بیکار ہوں گے۔ دنیا کے بڑے مذہب اس اعتراض سے اس لئے بچ نکلتے ہیں کہ وہ پرانے ہیں، اور ان کی تاریخ میں ایسے لوگوں کا ذکر آتا ہے جنھوں نے اپنے مذہب کے اعلیٰ اصولوں پر خلوص کے ساتھ عمل کیا، اور روحانی اور اخلاقی اعتبار سے ممتاز ہوئے۔ گاندھی جی ہمارے زمانے میں تھے، اور اب بھی کئی لاکھ بلکہ کئی کروڑ ایسے لوگ ہوں گے جن کی اپنی زندگی پر گاندھی جی کی جدوجہد کا اثر پڑا۔ یہی لوگ اب سوچ رہے ہیں کہ اپنے آپ کو کس طرح گاندھی جی کا پیرو ثابت کریں اور ان کی تعلیمات کو قوم کا اخلاقی ورثہ کیسے بنائیں جب خود انھوں نے گاندھی جی کے اصولوں کو چھوڑ دیا ہے۔

میں بھی انھیں لوگوں میں سے ہوں۔ غالب کی طرح کبھی کہتا ہوں:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

کبھی کہتا ہوں:

سخن کوتہ مرا ہم دل بہ تقوے مائل ست امّا زننگ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائیہا

یعنی میں ضرور گاندھی جی کا پیرو ہو جاتا اگر ان لوگوں نے جو ان کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں طبیعت میں الجھن اور ضد نہ پیدا کر دی ہوتی۔ مگر یہ سب بہانے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھ میں اور اس زمانے کے تمام لوگوں میں اخلاقی حس ہے مگر بے اثر ہے، ہم برائیوں کو دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ مل کر ذرا بھی کوشش کریں تو وہ دور ہو سکتی ہیں مگر ہمت نہیں کرتے، اس لئے کہ ہمت کرنے کے سارے نتیجوں سے ڈرتے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ ہم چند سال اور اسی طرح ڈرتے رہے تو ہماری آدمیت خطرہ میں پڑ جائے گی۔

ہمارے ڈرنے کا سبب کچھ یہ بھی ہے کہ ہمارے سوچنے کا طریقہ غلط ہے۔ گاندھی جی کی

پیروی کرنے کے لئے ساری دنیا اور ساری دنیا کے مسائل کو میدان عمل بنانے کی ضرورت نہیں ۔ یہ کام چھوٹے پیمانے پر ہماری اپنی محدود زندگی میں بھی ہو سکتا ہے ۔ ایک چھوٹی سی تعلیم گاہ کا سدھار ہو سکتا ہے بغیر اس کے کہ اسے دنیا کی تمام تعلیم گاہوں کے سدھار کا مسئلہ بنایا جائے ، ہم آپس میں اہنسا کا اصول برت سکتے ہیں بغیر اس کا جواب دئے کہ چین نے حملہ کیا تو ہم یہی اصول برتیں گے یا نہیں ، ہم اپنے لباس ، اپنی غذا اور اپنے کام کے درمیان مطابقت پیدا کر سکتے ہیں بغیر یہ سوچے ہوئے کہ ہم اپنے لئے قاعدے بنا رہے ہیں یا ساری دنیا کے لئے ۔ شاید گاندھی جی بھی اپنے زمانہ میں یہی مشورہ دیتے کہ جو کچھ کر سکتے ہو کرو ، عالم گیر پیمانے پر نہ سوچو ، مگر سوال پوچھنے والوں نے انھیں چین نہیں لینے دیا ۔ انھیں بھی منطق اور فلسفے کا بہت بڑا سرمایہ ورثے میں ملا تھا ۔ کبھی کبھی منطق کے پھیر میں آ گئے ۔

یہ جلسہ ایک تعلیم گاہ میں ہو رہا ہے ہم مثال کے لئے اور کہیں کیوں جائیں ۔ اس وقت ہندوستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی حالت اچھی نہیں ہے ، اور بعض جگہ اتنی خراب ہے کہ تعلیم کا کام ہی نہیں ہو سکتا ۔ ہم اسے محسوس کرتے ہیں ، اس پر افسوس کرتے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ کر نہیں سکتے ۔ اب فرض کیجیے کہ ایسی تعلیم گاہ میں جہاں منتظم دیانت دار نہیں ہیں ، استاد محنت سے بے پروا اور فساد کرانے اور کرنے میں مشغول ہیں ایک نئے استاد کا تقرر کیا جاتا ہے ۔ اس کے سامنے تین راستے ہوں گے ، ایک یہ کہ وہ دوسروں کی طرح ہو جائے ۔ ایک یہ کہ وہ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو تعلیم گاہ کے معاملوں سے الگ رکھے ، اور اگر اس میں اخلاقی حس ہے ، تو ایک راستہ یہ ہوگا کہ وہ اصلاح کی کوشش کرے ۔ لوگ اس کے ارادے کی خبر پا کر پہلے اسے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں گے ، پھر اس کا مذاق اڑائیں گے ۔ اسے فساد کے معاملوں میں اس طرح پھنسانے کی تدبیریں کریں گے کہ اس کا اعتبار نہ رہے ۔ دوسری طرف منتظم اسے ڈرائیں دھمکائیں گے ، اسے نقصان پہنچائیں گے اور تعلیم گاہ چھوڑنے پر مجبور یا وہاں سے نکال دینے کے لئے چالیں چلیں گے ۔ اگر اس استاد میں خلوص ، ہمت اور سوجھ بوجھ ہے تو وہ اصلاح کا سلسلہ اپنے آپ سے شروع

کرے گا، کہ اسے اپنے اوپر اعتبار ہو جائے، اور دوسروں کو اپنی خیر خواہی سے متاثر کرے گا۔ اس
کا مطالبہ یہ ہوگا کہ تعلیم گاہ کی خرابیاں دور کی جائیں، وہ اپنے ساتھیوں کو اس پر آمادہ کرنا چاہے
گا کہ وہ ان خرابیوں کو دور کریں جو ان کے اندر پیدا ہو گئی ہیں، اس بنا پر کہ استاد فرض شناس
اور محنتی ہوں اور ایک دوسرے کے لئے اچھی مثالیں قائم کرتے رہیں تو تعلیم گاہ کی حالت آپ ہی
آپ بہتر ہو جائے گی۔ استادوں کی بڑی اکثریت میں یک جہتی پیدا ہو جائے اور تعلیم گاہ کی ترقی
کا ذریعہ بن سکے تو منتظموں میں اس کے ہمدرد پیدا ہو جائیں گے، اور وہ بدعنوانیاں جو اس وجہ سے
ہوتی ہیں کہ استادوں کی دیانت داری اور فرض شناسی کا اعتبار نہیں رہا ہے خود ہی دور ہو جائیں
گی۔

گو تعلیم گاہ کی اصلاح کا کام دنیا کی تاریخ میں شامل کرنے والا واقعہ نہ ہوگا، پھر بھی جو استاد
اس کا بیڑا اٹھائے گا اسے اپنے حوصلے کو قائم رکھنے کے لئے مذہب اور تاریخ میں اپنے لئے مثالیں
تلاش کرنی ہوں گی اور انسانی ہمدردی سے بالاتر کسی طاقت کا سہارا لینے کی ضرورت ہوگی۔ ہر نازک
موقع پر وہ سوچے گا کہ اگر میں اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہوتا تو مجھے کیا حکم ملتا، اپنے دل کو وہ خدا
کا حکم معلوم کرنے کا ذریعہ سمجھ لے گا، اور یہ ناممکن ہے کہ اس کی روحانی کیفیتوں کا اس کی روزمرہ
کی زندگی پر اثر نہ پڑے۔ مثلاً وہ سوچے گا کہ میں کسی وقت بھی برطرف کیا جا سکتا ہوں، اور اس کا
خوف میرے دل سے تبھی نکل سکتا ہے جب میں اپنے آپ کو بھوکا اور ننگا رکھنے کے لئے تیار
کرلوں۔ وہ سوچے گا کہ آدمی کی نیت پر ہمیشہ شبہہ کیا جاتا ہے، اس سے میں تبھی بچ سکوں گا جب
میں یہ ثابت کر دوں کہ مجھے اپنے لئے کچھ نہیں چاہیے، اور اپنے پاس اتنی ہی چیزیں رکھوں جتنی
کہ کام کو وقت پر اور ٹھیک سے کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ ایسا آدمی جو فیصلے کرے گا وہ سب
اس کے اپنے لئے ہوں گے، مگر وہ انھیں ٹھیک سمجھتا ہوگا، اس لئے سوال کے جواب میں کہے گا
کہ انھیں ٹھیک سمجھتا ہوں۔ جواب سننے والوں میں سے بعض کو اس کے عقیدے اور عمل میں اعلیٰ
روحانی مرتبہ نظر آئے گا، بعض کہیں گے کہ اسے آپ کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچانے کا خبط ہے۔ تعریف

ہیں سب شریک ہو جائیں گے، معاملے کو سمجھنے والے بہت کم ہوں گے۔

گاندھی جی جس لڑائی میں شریک ہوئے وہ خیر و شر کی، نیکی اور بدی کی، انصاف اور ظلم، انسان دوستی اور انسان دشمنی کی لڑائی ہے۔۔ یہ جاری رہے گی جب تک کہ نئے آدمی اور نئے حالات پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس کا مقصد کبھی نہیں بدلے گا، مقصد کے لئے لڑنے والے اور مقابلے کے میدان بدلتے رہیں گے۔ اس لڑائی کی یہ بڑی خصوصیت بھی ہمیشہ رہے گی کہ لڑنے والوں کو سمجھایا نہ جا سکے گا کہ وہ کس کے ساتھ اور کس کے خلاف لڑ رہے ہیں، اس لئے کہ یہ کبھی کوئی مانتا ہی نہیں کہ وہ بدی اور ظلم اور انسان دشمنی کا آلۂ کار ہے یا ان کی حمایت کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے گاندھی جی کے اصولوں کا تعلق خاص معاملوں سے نہیں رہا بلکہ انھوں نے ایک فلسفۂ حیات اور نظامِ حیات، ایک پورے دھرم اور زندگی کے سدھانتوں کی شکل اختیار کر لی۔ گاندھی جی نے اہنسا کی تعلیم اس نیت سے نہیں دی کہ انگریزوں کو بغیر خون خرابے کے ہندوستان سے نکالا جائے، نہ انھوں نے چرخا چلانے اور کھدر پہننے کی ہدایت دیتے ہوئے یہ کہا کہ ابھی ہم موٹا کپڑا پہنیں گے پھر جب ریشم ملے گا تو ریشم۔ وہ ہر موقع پر اور ہر طرح سے سمجھاتے رہے کہ انسان کی نیت، اس کا دل صاف رہنا چاہیے۔ اہنسا ایک اخلاقی اصول ہے، اسے سیاسی مصلحت نہیں بنایا جا سکتا، اور اہنسا کے سلسلے میں انسان کو جو کچھ کرنا ہو وہ ایک اخلاقی حکم ہے، جسے بجا لانا لازمی ہو جاتا ہے۔

ہم چاہے اسے صاف صاف نہ کہیں مگر ہمارے دلوں میں یہ سوال ضرور ہے کہ جب ہمارے ملک میں کوئی مخالف طاقت نہیں رہی تو پھر اہنسا کا اصول برتنے کا موقع کیا ہے۔ بے شک، قوم کے بہت بڑے حصے پر غم اور غصے کی کیفیت طاری ہے اور منافقتوں کی کمی نہیں ہے۔ تشدد بھی ہر طرف ہو رہا ہے۔ ایک طرف وہ تشدد کرنے والے ہیں جو کہتے ہیں کہ جب تک ہم ہنگامہ برپا نہ کریں ہماری بات نہیں سنی جاتی، ہمارے مطالبوں پر غور نہیں کیا جاتا، دوسری طرف امن و امان کے ذمے دار ہیں، جو پوچھتے ہیں کہ بتائیے ہم کب تک تشدد پسندوں کی مار کھاتے رہیں بہت سے شرارت پسند ہیں جن کی شناخت اور گرفت کرنا تقریباً ناممکن ہے، اور یہ ایسے

معاملوں کو بھی جو صلح و آشتی سے طے ہو سکتے ہیں لڑائی کی شکل دیدیتے ہیں۔ مگر ایسی حالت میں اہنسا برتی جائے تو کیسے اور ستیاگرہ کی جائے تو کس کے خلاف اور کس طریقے سے کی جائے۔

گاندھی جی زندہ ہوتے اور اس کیفیت کو دیکھتے تو شاید وہ کہتے کہ اب وہی پرانی بات ثابت ہو رہی ہے کہ انسان کا سب سے بڑا مخالف اس کا اپنا نفس ہے، جو اپنا فرض ادا نہ کرنے اور دوسروں پر الزام لگانے کی دلیلیں اور ترکیبیں سوچتا رہتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں مکتی اور نروان، ثواب اور عذاب کی بات نہیں کرتا، مجھے صرف دنیا سے اور دنیا کے کاموں سے مطلب ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کاموں کو دیانت داری اور سچائی کے ساتھ وہی انجام دے سکتا ہے جو انسانوں اور انسانیت کا خیرخواہ ہو۔ اہنسا کی چاہے ظاہری شکل یہ ہو کہ آدمی کسی کو تکلیف نہ پہنچائے، اس کی جان، اس کا جوہر خیرخواہی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ جو دوسروں کا خیرخواہ نہ ہو یا خیرخواہی کو اپنے عمل کے ذریعہ ظاہر نہ کرے وہ بھی ہنسا اور تشدد کرتا ہے۔ حکومت کے کام کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت سوچتے رہیں کہ حکومت کو کس طرح جنتا کی فلاح و بہبود اور ملک کی ترقی اور امن امان کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں تو حکومت ایک بوجھ بن جاتی ہے، جنتا کے کندھوں پر سوار ہو کر چلتی ہے اور یہ میرے نزدیک تشدد ہے۔ مگر حکومت پر الزام لگانے سے پہلے میں دیکھوں گا کہ اس میں جنتا کی ذمہ داری کتنی ہے۔ جہاں سب سست ہوں وہاں حکومت بھی سست ہو گی، جہاں ہر ایک اپنا فائدہ چاہتا ہو گا وہاں حکومت جنتا کی خیرخواہ کیسے ہو گی، نیتا اور سرکاری ملازم سب اپنے فائدے کی فکر میں پڑ جائیں گے۔ جب لوگ صرف اپنی ضرورت کو دیکھ کر اور سب کے فائدے کو نظرانداز کر کے کسی مال کو خریدنے کی ہوس میں بالکل بے قابو ہو جائیں گے تو اس کی قیمت ضرور بڑھ جائے گی اور مال بھی خراب ملے گا، جب ہر حق دار کا حق برابر نہ سمجھا جائے گا اور لوگ سفارشیں کرا کے اپنے حق سے زیادہ وصول کرنے لگیں گے تو نہ قابلیت کا اعتبار رہے گا نہ قابلیت کی جانچ کرنے والوں کا۔ ایسی حالت میں ان لوگوں کو جو ملک کی زندگی کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں سب کی بھلائی کی خاطر پہلے اپنی اصلاح کرنا چاہیے۔ اگر وہ خلوص اور سچائی کے ساتھ اس میں لگ جائیں گے تو یا تو باقی لوگ انھیں اپنا دشمن سمجھ کر ان کی مخالفت کریں گے یا ان کے ساتھ اتنے مل

ئے کہ خیرخواہ اور بدخواہ میں فرق کیا جا سکے گا اور دونوں مقابلے پر آجائیں گے۔ اب آپ بتائیے کہ اہنسا کو ایک دائمی اصول ٹھہرانا خواہ مخواہ مذہب اور اخلاق کو خالص سیاسی اور سماجی معاملات میں دخل انداز کرنا ہے یا ایک عقل کی بات ہے، جسے ہر ہوشیار آدمی کو ماننا ہی چاہیئے۔

یہ ہے گاندھی جی کا کہنا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ آخر دنیا کی دوسری قوموں کا کام کیسے چلتا ہے جنھوں نے مذہب اور اخلاق کو بحث میں لانا چھوڑ دیا ہے۔ اس کا جواب وہ لوگ جو گاندھی جی کے پیرو کہلاتے ہیں یہ دیتے ہیں کہ دراصل ان قوموں کا کام محض دیکھنے میں چل رہا ہے، وہ تشدد پر عمل کرتی ہیں اور ان کی زندگی میں ہر طرف ظلم، بداخلاقی اور تباہی کے آثار نظر آتے ہیں۔ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ ان قوموں میں فرض شناسی ہے، سب کی بھلائی کا خیال ہے، اخلاقی حس ہے۔ بے شک سب میں نہیں مگر اتنی بڑی اور بااثر اقلیت میں کہ وہ ظلم اور جنگ کے صدموں کو برداشت کر لیتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے روشن خیال طبقوں میں گاندھی جی کا اثر بہت ہے۔ ہم اگر اپنے آپ کو سمجھا سکیں کہ گاندھی جی ہمارے ہی نہیں ساری دنیا کے تھے، اور اگر ہم نے ان سے منہ پھیر لیا تو نقصان ہمارا ہوگا، گاندھی جی اور دنیا کا نہ ہوگا تو شاید ہم گاندھی جی کی تعلیمات سے زیادہ اثر لے سکیں گے۔ گاندھی جی کے ساتھ یا ان کی وجہ سے ہم اخلاق اور روحانیت کی بلندیوں پر نہیں پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں بہت سی منزلیں طے کرنا ہے اور مشکل مقاموں سے گذرنا۔ اور شاید جتنا ہم اپنے آپ کو منزل سے دور سمجھیں گے اتنی ہی ثابت قدمی سے آگے بڑھ سکیں گے۔

پروفیسر خواجہ غلام السیدین

خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد

(میرٹھ یونیورسٹی، ۱۱ر جنوری ۶۹ء)

یونیورسٹیوں کی کامیابی کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ان کے حکام حکومت اور قوم اور سماج کو ساتھ لے کر چلیں بلکہ اس میں اپنے استادوں اور شاگردوں کو بھی کھلے دل کے ساتھ شریک کرنا ضروری ہے۔ یہ اس کام میں ہمارے ساتھی تو ہمیشہ سے رہے ہیں، لیکن اب نئی تحریکوں کے اثر سے، نئی محرومیوں کے پیدا ہو جانے سے اور بعض پرانی روایتوں اور وضع داریوں کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے انھیں اپنے رول کی اہمیت کا احساس بہت بڑھ گیا ہے۔ یہ طالب علم تعلیمی حکام کے دروازوں پر آکر دستک دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنی تکلیفوں سے آپ کو آگاہ کریں اور اگر دروازے نہیں کھلتے، خواہ وہ مکان کے دروازے ہوں یا دل کے دروازے، اور خواہ وجہ کچھ بھی ہو، وہ ان کو توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں اس طریقۂ عمل کی سراہنا نہیں کرسکتا، گو ان کی ذہنیت سمجھ سکتا ہوں۔ میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ دروازوں کو بند رکھنا بھی بُرا ہے اور دروازوں اور ریلوں کو توڑنا بھی۔ اچھے استاد یا پرنسپل کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کو کھلا رکھے تاکہ ان کو توڑنے کی نوبت نہ آئے۔ ریلوں کو توڑنے کی سزا تو فوراً ہی مل جاتی ہے کیونکہ کارواں کا سفر رک جاتا ہے لیکن دروازوں کو توڑنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ میں طلبہ سے بڑی نمرتا کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر دروازہ کھولنے میں دیر بھی لگے تو تھوڑا سا صبر دکھانا کوئی نامناسب بات نہیں ہے۔

ہمارے ملک نے آزادی حاصل کرنے کے بعد پچھلے بیس سال میں بعض لحاظ سے جو ترقی کی ہے، صنعت و حرفت میں، کھیتی باڑی میں، پانی بجلی کی سکیموں میں، بیماریوں کی روک تھام میں، تعلیم کی اشاعت میں اس کا آپ کو یقیناً اندازہ ہے اور ہمیں سب کو اس کی خوشی ہے۔ لیکن جو راستہ طے ہو گیا ہے وہ میری نظر میں ماضی ہے، جو راستہ باقی ہے وہ مستقبل ہے اور مجھے ہمیشہ ماضی سے زیادہ مستقبل سے دلچسپی رہی ہے اور اس کی فکر۔ میں چاہتا ہوں کہ اس وقت بجائے اپنے قومی کارناموں کو دہرانے اور ان پر فخر کرنے کے میں ان پریشانیوں اور الجھنوں کی طرف اشارہ کروں جن میں ہم آج کل پھنسے ہوئے ہیں اور جو گذشتہ چند سال سے بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ جدھر دیکھتا ہوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارے دلوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی حماقت اور تعصب کی وجہ سے ان کو توڑا ہے وہ بدبخت سمجھتے ہیں کہ گویا انھوں نے بڑا تیر مارا ہے۔ کاش یہ دلوں کے توڑنے والے اتنی سی بات سمجھ سکتے کہ

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
دل کی بستی کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

ان دلوں کو دوبارہ جوڑنا دیش کے تمام بھلا چاہنے والوں کا، اس کے نیتاؤں کا، شاعروں کا، فلسفیوں کا، ناول اور افسانہ نگاروں کا، والدین کا اور (آپ مانیں یا نہ مانیں) سیاسی پارٹیوں کا (کسی ایک کا نہیں، سب پارٹیوں کا) فرض ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ہمارے طالب علموں، استادوں اور پروفیسروں کا فرض ہے کیونکہ تاریخ ان سے جواب مانگے گی کہ تم نے اس فرض کو کیوں پورا نہیں کیا۔ لہٰذا ان ادب اور فلسفہ اور تاریخ اور سائنس کے شیشہ گروں سے میری درخواست ہے کہ

"دل ٹوٹا بنا دو تو بڑی شیشہ گری ہے"

ہو سکتا تھا کہ میں اپنے ایڈریس میں اس وقت بعض ان تعلیمی، سیاسی، تہذیبی مسئلوں اور مشکلوں اور ان نت نئے جھگڑوں کی طرف اشارہ کروں جو اپنے سر سانپوں کی طرح اٹھا رہے ہیں۔ لیکن سوچتا ہوں کہ اس سے کیا حاصل؟ ان کا ذکر تو آپ روز ہی سنتے رہتے ہیں۔ تقریروں

میں بار بار ان کا چرچا کیا جاتا ہے۔ اخباروں میں ان کی خبریں چھپتی ہیں۔ اور اگر آپ کا دل بھی اتنا ہی
جلد چوٹ کھا جاتا ہے جس قدر میرا تو شاید آپ کا منہ بھی صبح صبح ان خبروں کو پڑھنے سے باقی دن بھر کے لئے
کڑوا ہو جاتا ہوگا۔ اس لئے میں اس وقت آپ سے صرف دو تین بنیادی باتیں کہنا چاہتا ہوں جن پر
میرے خیال میں ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ اس انداز سے نہیں جو ایڈریس دینے والے عام طور پر
اختیار کرتے ہیں جیسے حضرت عیسیٰ پہاڑ کی چوٹی پر سے وعظ کر رہے ہوں (ان کو تو ایسا کرنے کا حق
تھا) بلکہ جس طرح دوست ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ ان کی بات سنتے ہیں، اپنی
بات سناتے ہیں۔ اور مقصد یہ نہیں ہوتا کہ دلیل کی بازی میں کون جیتتا ہے (وہ کھیل تو عدالت
میں وکیلوں کا یا پولیس کے افسروں یا پیشہ ور گواہوں کا کھیل ہے) بلکہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ
کسی طرح سچ تک پہنچ سکیں، سچائی جو کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ جس کی تلاش کر سکتے ہیں، ایسی
جو کبھی ختم نہیں ہوتی، مگر اس پر قبضہ نہیں جما سکتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ گاندھی جی نے اپنی آپ بیتی
کا نام "تلاش حق" (My experiments with truth) کیوں رکھا تھا؟ اس لئے
کہ ان کو یہ غلط فہمی نہ تھی کہ وہ سچ کی آخری منزل تک پہنچ چکے ہیں جس کے آگے کچھ نہیں بلکہ وہ دھیرے
دھیرے اپنی زندگی کے تجربوں کے ذریعہ اس منزل کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ایک
بہت بڑے سائنس دان نیوٹن نے سچی خاکساری کے ساتھ کہا تھا کہ میری مثال تو ایسی ہے کہ ایک
بچہ سمندر کے کنارے بیٹھا پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے کھیل رہا تھا اور اس کو یہ تک معلوم
نہیں کہ سمندر کی تہہ میں کیسے کیسے پھول پتے جانور، موتی اور دوسرے عجائبات چھپے ہوئے ہیں۔
میرا یہ دعویٰ نہیں کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے اور جو میں کہوں گا وہ آپ کو ضرور مان لینا چاہیے
لیکن یہ جرأت ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو چند ایسی باتوں کی طرف توجہ دلاؤں جن کے بغیر شاید
ہم زندہ تو رہ سکتے ہیں لیکن وہ زندگی انسان کی شان سے گری ہوئی ہوگی۔ میں ضمناً یہ بھی عرض
کر دوں کہ کسی قوم کو اس خیال میں مگن نہ رہنا چاہئے کہ وہ خدا کی یا بھگوان کی یا مقدس باپ کی محبوب
اولاد ہے جس کے نام اس نے دنیا کی وراثت ہمیشہ کے لیے لکھ دی ہے۔ لہذا وہ کچھ بھی کرے

عالم کائنات میں اس کی ساکھ قائم رہے گی! بہت سی تہذیبیں آئیں۔ شعلہ کی طرح تھوڑی یا زیادہ دیر تک چمکیں اور گذر گئیں۔ بہت سے ملکوں نے ترقی کا پرچم بلند کیا اور پھر اپنی بداعمالی اور بداخلاقی کی وجہ سے اس کو اپنے فالج زدہ ہاتھوں سے گرا دیا۔ یونان، مصر، روما، بابل کی پرانی تہذیبیں سب ایک کے بعد ایک، مٹ گئیں اور ان کی یاد اب صرف تاریخ کے صفحوں میں رہ گئی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ عزت اور انسانیت کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے جن شرافتوں اور قدروں کو زندگی میں برتنے کی ضرورت تھی، جن اصولوں پر عمل کرنے کی ضرورت تھی، دل اور دماغ کو جن سانچوں میں ڈھالنے کی ضرورت تھی وہ ان شرطوں کو پورا نہ کر سکے یا ان کو عیش وعشرت نے گھیر لیا جس کے چکر میں پھنس کر وہ کام کی طرف سے غافل ہو گئے، کام جو انسان کو بناتا اور سنوارتا ہے، یا خود غرضی اور نفس پرستی میں مبتلا ہو گئے اور یہ بھول گئے کہ ان کا دوسرے انسانوں کے ساتھ کیا رشتہ ہے یا ان کے دل ٹھٹھر کر رہ گئے اور دماغ تاریکی کی پناہوں میں سو گئے یا انھوں نے علم کے ساتھ اپنا رشتہ توڑ لیا اور اس کے بڑھتے ہوئے دھارے ان کو ایک طرف چھوڑ کر آگے نکل گئے یا انھوں نے صرف ماضی کی پوجا کو اپنا دھرم بنا لیا اور نہ حال کی طرف دیکھا نہ مستقبل کی طرف دھیان دیا۔ علم بڑھتا گیا، صنعت وحرفت میں نئے راستے کھلتے گئے، سائنس اور ٹکنولوجی نے سمندر کی تہہ اور زمین کے پیٹ میں چھپے ہوئے خزانوں کی کھوج کی اور دوسری بیدار اور ہوشیار قوموں نے ان کو سمجھا لیا اور آج وہ ان پر کمندیں ڈال رہی ہیں اور ہم محض اس کا تماشا دیکھ رہے ہیں کہ روسی پہلوان نے امریکی پہلوان کو پچھاڑا یا امریکی پہلوان نے روسی پہلوان کو! بہت سی قوموں نے اس انقلاب کو نہ سمجھا۔ بعض نے اس کو دیکھنا اور اس کی طرف توجہ کرنا بھی عرصہ تک گوارا نہ کیا بلکہ بغیر سوچے سمجھے یہ حکم لگا دیا کہ یہ سب شیطانی چیزیں ہیں جن سے ہمیں کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ اسی وجہ سے بہت سی باتوں میں پچھلے دو سو برس میں مغرب مشرق پر بازی لے گیا۔ بہرحال کہنا یہ تھا کہ تباہی تک جانے کے بہت سے راستے ہیں اور مختلف لوگوں نے مختلف راستوں کو اختیار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی قوم قدرت کے قانون کو توڑتی ہے تو قدرت کچھ عرصے تک اسے ڈھیل،

دیتی ہے تاکہ وہ غلط راستے پر چلنے سے باز آئے۔ لیکن جب وہ اس راستہ کو نہیں چھوڑتی تو دیر یا سویر کوئی مصیبت، کوئی ناگہانی آفت اس کے کرتوتوں کی سزا میں اس کو آپکڑتی ہے۔ اسی لئے مذہبی خیال کے لوگ کہتے ہیں کہ خدا کے یہاں دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں ہو سکتا۔ اس کی لاٹھی ضرور چلتی ہے گو اس میں آواز نہ ہو اور جب ان کی مقررہ اجل یا مدت پوری ہو جاتی ہے تو پھر ادھر یا ادھر ایک پل کی دیر نہیں ہو سکتی۔"

قوموں کا یہ عروج اور زوال، ان کا بڑھنا اور گھٹنا تاریخ میں شروع سے ہوتا رہا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا تباہی کے ان راستوں میں کوئی مشترک چیز بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک دو بنیادی چیزیں مشترک ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو قومیں نیائے مارگ پر نہیں چلتیں، دوسری قوموں کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کا سلوک روا سمجھتی ہیں یا خود اپنی کسی جماعت یا فرقہ کے ساتھ ناانصافی برتتی ہیں وہ اپنے ہاتھوں اپنے مستقبل کو خراب کرتی ہیں۔ ممکن ہے اس انجام کے پیش آنے میں بہت مدت لگ جائے یا نتیجہ جلد ہی سامنے آجائے۔ لیکن اس سے بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ نازی اور فاشسٹ نظام چند سال کے اندر پھلے پھولے اور تباہ ہو گئے، کیونکہ انھوں نے امن عالم کو خطرے میں ڈالا اور ان تمام لوگوں کو غلام بنانے یا ملیامیٹ کرنے کی کوشش کی۔ جو ان کے ہم نسل یا ہم خیال نہ تھے۔ برخلاف اس کے امریکہ، مغربی افریقہ اور روڈیشیا کے حبشی دشمنوں اور دوسرے نسلی پاگلوں کو اپنے کرتوتوں کی سزا ملنے میں دیر لگ رہی ہے۔ ہم نے خود ہزاروں برس سے اپنے اچھوتوں کے ساتھ ذلت اور اتیاچار کا سلوک کیا اور ان کو نہ صرف اعلیٰ جاتیوں کے مقابلہ میں بہت حقیر جانا بلکہ سرے سے انسان ہی نہیں سمجھا۔ معلوم نہیں کیسے ہم اس گھناؤنی گناہ کی سزا سے اب تک بچے رہے ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ اس طویل عرصے میں ہماری قوم میں ایسے مہاپرش پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اس ظلم کے خلاف اپنی آواز مضبوطی کے ساتھ اٹھائی اور ذات پات کے ان بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ ہمارے آپ کے سامنے اور ہماری یاد میں اس زمین کی مٹی سے ایک ایسے بندۂ خدا نے جنم لیا جس نے اس

سوال پر اپنی جان کی بازی لگادی اور کم سے کم جہاں تک قانون اور دستور کا تعلق ہے اس کلنک کے ٹیکے کو ہماری پیشانی سے مٹا دیا۔ اگرچہ مجھے شبہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے دل سے یہ دھبّہ اب تک دور نہیں ہوا۔

یہ برائیاں، یہ خرابیاں، یہ گندگی خواہ دنیا کے کسی حصہ میں پائی جائیں انسان کی ذلت کا باعث ہیں یعنی ہم سب کی ذلت کا۔ یہ پیدا کیوں ہوتی ہیں؟ اس لیے کہ انسان نے اپنے دل اور دماغ کی کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کر لیا ہے۔ اس نے خود غرضی اور نفس پرستی کے قلعوں میں پناہ لے لی ہے اور انسان کے ایکتا کے تصور کو بھلا دیا ہے۔ اس کو ہر انسان میں، خواہ اس کا رنگ، مذہب، ذات پات، نسل کچھ بھی ہو، نہ انسانیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے نہ خدا کے نور کا جلوہ۔ حالانکہ یہ وہ سبق ہے جو لاکھوں نبی، رشی، منی، صوفی، سنت اور ایسے انسان دوست بھی جو کسی مذہب سے تعلق نہ رکھتے تھے سکھاتے اور دہراتے رہے ہیں۔ ان کا اثر بھی ہوا کبھی کم کبھی زیادہ۔ اس کی وجہ سے ہمارا سوتا ہوا ضمیر بار بار جاگا بھی اور پھر سو گیا۔ مگر ہم باوجود ان تمام کوششوں کے اس موذی مرض کی جڑوں کو اپنی فطرت کی سرزمین سے کھود کر نہ نکال سکے۔ یہ شکلیں بدل بدل کر ہمارے سامنے آتا رہا۔ کبھی اس نے مذہبی تعصب کا روپ اختیار کیا اور ہسپانیہ کی مذہبی عدالت کے بھیس میں لاکھوں عیسائیوں کو، جن کو اکثریت کے بعض عقیدوں سے اختلاف تھا، سولی پر چڑھایا، آگ میں جلایا، شکنجے میں کسا اور طرح طرح کی ایذائیں دے کر موت کے گھاٹ اتارا۔ کبھی اس نے نسلی تعصب کے مکروہ بھیس میں لاکھوں جرمن یہودیوں کو بجلی کی بھٹیوں میں ڈال کر ان کا ایندھن بنایا لیکن پہلے یہ احتیاط کی کہ ان مظلوموں کے دانت توڑ کر ان کا سونا نکال لیا۔ کبھی اس نے سرمایہ داری کی بے حسی یا اندھے لالچ میں اپنے ہی جیسے جیتے جاگتے ہم قوم انسانوں کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا۔ کبھی اس نے کمیونزم کی حمایت کے نام پر اپنے اصلی اور فرضی مخالفوں کو قید و بند اور پھانسی اور گولی کا شکار بنایا۔ کبھی اس نے جمہوریت کا نقاب اوڑھ کر آسٹریلیا کے پرانے باشندوں کا شکار اس طرح کھیلا جس طرح لوگ جنگلی جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔ کبھی

اس نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم پھینک کر دنیا کے لیے ایک ایسی قیامت کا راستہ کھول دیا جو
دوزخ کا افسانہ بھی انسان کے دل سے بھلائے دیتی ہے۔ کبھی اس نے آزادی کے حصول کے وقت
ہندوستان اور پاکستان میں ہندو مسلم سکھ فسادات اور خون ریزی کے ایسے کھیل دکھائے جس سے ان
دونوں ملکوں کا سر شرم کے مارے جھک جانا چاہیے۔ غرض کون کس پر پتھر پھینکے اور کون کس پر نام
دھرے؟ یہ دنیا تو ایک ایسا حمام ہے جہاں سب ہی ننگے ہیں۔ جب سوچتا ہوں کہ تاریخ کے
سفر میں انسان نے انسان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ میں سے بعض
نے امریکہ کے ایک مشہور شاعر اور ادیب آرکیبالڈ میک لیش (Archibald Macleish)
کا نام سنا ہوگا۔ اس نے اپنے ایک دل ہلا دینے والے ڈرامہ میں (جس کا نام Job ہے) حضرت
ایوب کی کہانی کو ایک نئے اور حال کے روپ میں پیش کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ اس نے لکھا ہے:

"Millions and millions of mankind,
hunted, crushed, mutilated, broken,
slaughtered and for what ? For thinking
For walking round in the world, in the
wrong skin, the wrong shaped noses,
eyelids! Living at the wrong address -
London, Berlin, Hiroshima, wrong night,
wrong city. There never could have been
so many suffered more for less".

"کروڑوں انسان ہیں جن کو جلایا گیا۔ کچلا گیا۔ ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔ ان کو موت کے
گھاٹ اتارا گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ انھوں نے سوچنے کا جرم کیا تھا۔ اور بعض دفعہ محض اس لیے کہ
وہ دنیا میں پیدا ہوئے اور ان کی کھال غلط رنگ کی تھی۔ ان کی ناک غلط شکل کی تھی۔ ان کے پیشے
دوسروں سے مختلف تھے۔ یا وہ غلط شہروں میں رہتے تھے۔ خواہ ان کا نام لندن ہو یا برلن یا
ہیروشیما۔ یا ان کے یہاں رات غلط وقت ہوتی تھی۔ یقین نہیں آسکتا کہ اتنے ان گنت آدمیوں
نے اتنی ذرا ذرا سی بات پر اس قدر عذاب برداشت کیا۔" معلوم ہوتا ہے ان سب نام نہاد

انسانوں کے دل پتھر کے ہو گئے تھے بلکہ ان سے بھی بدتر کیونکہ پتھروں سے تو کبھی کبھی پانی کے چشمے بھی پھوٹ نکلتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی کبھی خدا کے خوف سے گر بھی پڑتے ہیں لیکن ان انسانی پتھروں کا کوئی کیا کرے ؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان حالات میں سب ولیش پریمیوں کا اور خاص کر یونیورسٹیوں اور کالجوں کا سب سے بڑا فرض یہ نہیں ہے کہ وہ ان جانوروں کو انسان بنائیں ، ان کے من مندر میں پریم کے چراغ جلائیں ، ان کے دل میں ایکتا کی لگن لگائیں یہ سبق بہت پرانا ہے لیکن بنیادی ہے کیا یہ کام کتابی تعلیم سے ، سائنس کے تجربوں سے ، امتحان پاس کرنے سے زیادہ ضروری نہیں ؟ میرا یہ مطلب نہیں کہ ان دونوں میں کوئی تضاد ہے یعنی یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے ۔ یقیناً ہو سکتے ہیں ۔ لیکن جو تعلیم اس مقصد ہی کو نہ بہچانے ، جو علم کو نیک اور شریف زندگی کا ذریعہ نہ بنائے وہ کس کام کی ؟ میں دوسری تہذیبوں سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہر تہذیب میں بہت سی اچھی قدریں ہیں ۔ لیکن آپ کو اتنا ضرور یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہماری تہذیب کی گہرائیوں میں بعض بہت حسین قدریں محفوظ ہیں جو مختلف سمتوں سے اس کے کیسے میں آئی ہیں ۔ ہندو تہذیب سے ، یونانی تہذیب سے ، بدھ اور جین تہذیب سے ، اسلامی تہذیب سے اور انگریزی تہذیب سے جو باوجود اپنی زیادتیوں کے بہت سی اچھی اچھی چیزیں بھی اپنے جلو میں لائی تھی ۔ اس ہندوستانی تہذیب کا ایک بنیادی سبق یہ ہے کہ سب انسان ایک ہیں ، بھائی بھائی ہیں ۔ بے شک وہ دیکھنے میں الگ الگ ہیں ۔ ہر انسان ایک فرد ہے یعنی اپنی انفرادیت رکھتا ہے جس کا پالن ہمارا فرض ہے ۔ لیکن اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ وہ ایک کل کا جزو ہے ایک سمندر کا قطرہ ہے اور کوئی جزو ایک دوسرے سے جدا نہیں ۔ ہم سب ایک ہی جوہر سے بنے ہیں اور اس وجہ سے ایک دوسرے کے اعضا ہیں ۔ اور یہ سبق صرف ہماری تہذیب کے لیے مخصوص نہیں ۔ کون سی تہذیب اور کون سا مذہب ہے جو اس راز سے واقف نہیں ؟ ہمارے مشہور شاعر اقبال نے کہا ہے :

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

یعنی فرد کی زندگی کے لئے ملت سے وابستگی ضروری ہے اور سمندر کی لہر کا وجود سمندر کے اندر ہی ہو سکتا ہے اس سے باہر ممکن نہیں۔ اور انگریزی کے مشہور شاعر جان ڈن کا مقولہ بھی ذہن میں رکھئے:

> "کوئی آدمی اپنی جگہ پر ایک جزیرہ نہیں ہوتا۔ وہ تو پورے براعظم کا ٹکڑا ہے، پورے سمندر کا ایک حصہ ہے۔ اگر سمندر ایک ڈھیلے کو بھی بہا کر لے جائے تو سارے یورپ کو اس کا نقصان پہنچے گا۔۔۔۔ (اسی طرح) ہر شخص کی موت مجھ کو گھٹاتی ہے۔ کیونکہ میں پوری نسل انسانی سے وابستہ ہوں۔ لہذا جب تمہارے کانوں میں گھنٹیوں کی آواز پہنچے تو یہ مت دریافت کرو کہ یہ کس کی موت کی سناونی ہے۔ دراصل یہ تیری ہی موت کی خبر ہے۔"

لہذا ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ انصاف اور رحم، پیار اور کرونا کی روایتوں کو اپنی زندگی میں مضبوط کریں اور ہنسا کا زہر جو ہمارے سماج کی شریانوں میں تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے اس کو نکالنے کی کوشش کریں۔ جب پولیس ودیارتھیوں پر حملہ کرتی ہے تو اس کی لاٹھیاں اور گیس صرف انھیں کو زخمی نہیں کرتیں بلکہ وہ ہم سب کو بھی مجروح کرتی ہیں۔ جب سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کے افسر یا ملک کی حکومتیں ان کی جائز شکایتوں اور تکلیفوں کو دور نہیں کرتیں بلکہ بعض دفعہ ان کی طرف توجہ بھی نہیں کرتیں تو وہ خود بھی اپنی حماقتوں کی سزا بھگتتی ہیں۔ اسی طرح جب ودیارتھی پولیس پر حملہ کرتے ہیں یا بسیں اور سینما جلاتے ہیں یا ریلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں یا اپنے استادوں اور امتحانوں میں نگرانی کرنے والوں کو زدوکوب کرتے ہیں تو وہ بھی تعریف اور شکریہ کے مستحق نہیں۔ ان کی مثال تو ایسی ہے جیسا آسکر وائلڈ کے ڈراما Picture of Dorian Grey میں اس خنجر کی جو اس نے اپنی تصویر کے سینے میں بھونکا تھا لیکن دیکھا تو وہ خود اس کے سینے میں پیوست تھا۔

یونیورسٹی طلبہ کا جو مزاج بنائے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ خود اپنے پیار اور اپنے کاموں پر سختی کے ساتھ احتساب کرنا سیکھیں اور اپنی خرابیوں اور کمزوریوں کو دور کریں۔ یہ کام نہ ملک کا قانون کر سکتا ہے، نہ ہمارے دوست نہ دشمن۔ وہ اس میں مدد دے

سکتے ہیں، ہماری اصلی ذمہ داری کو نہیں اٹھا سکتے۔ کسی فرد، کسی جماعت، کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ خطرناک کوئی بات نہیں کہ اسے دوسروں کی صرف برائیاں دکھائی دیں اور اپنی خوبیاں۔ جب ہمارے کالج اور یونیورسٹیاں اس اندیشہ کو محسوس کریں تو ان کو جرأت کے ساتھ خطرے کی گھنٹی بجانی چاہیے۔

دل اور دماغ کی فراخی کے علاوہ تعلیم کو قومی کیرکٹر میں دیانت داری اور جرأت کے لیے جگہ بنانی چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دو صفات ہمارے دلیش کے لاکھوں گمنام انسانوں میں موجود ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ پبلک لائف میں یہ بہت کم ہوتی جارہی ہیں۔ دیانت داری سے میری مراد صرف روپے پیسے کے معاملے میں ایمانداری نہیں (وہ تو اس کا بہت ضروری لیکن چھوٹا سا حصہ ہے) بلکہ فکر کی دیانت داری، عمل کی دیانت داری، سماجی رشتوں کی دیانت داری جس کے بغیر سماج میں نیائے اور انصاف کا چلن ممکن نہیں۔ مگر کہاں ہے یہ دیانت داری؟ نہ دفتروں میں، نہ کاروبار میں، نہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں اور ودھان سبھاؤں میں، نہ بیشتر نیتاؤں میں! اور یاد رکھئے کہ اس دیانت داری کا بہت گہرا سمبندھ ہے جرأت کے ساتھ، جس کا تقاضہ ہے کہ آدمی سچائی کے راستہ پر چلے، اس پر اپنے قدموں کو مضبوطی کے ساتھ جمائے اور اس راستے میں جو خطرے پیش آئیں ان کا مقابلہ کرنے کو تیار رہے۔ لیکن جرأت کی امید نہیں ہوسکتی ان لوگوں سے (خواہ ان کا تعلق کسی بھی سیاسی یا سماجی یا مذہبی گروہ سے ہو) جو یا تو اپنی دفتری اور سرکاری کرسیوں سے اس طرح لپٹے ہوئے ہوں جیسے انھیں کیلوں کے ذریعہ ٹھونک دیا گیا ہو یا اپنی ذات یا مذہب والوں کی بے جا طرفداری کریں اور ان کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہ ہوں، خواہ وہ کتنی ہی غلطی پر کیوں نہ ہوں، جن کو سیاست میں سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہو کہ اگلے انتخاب میں کیا ہوگا اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے کون سے جائز یا ناجائز طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں، جو انصاف اور سچائی کا ساتھ نہ دیں بلکہ یہ فکر ہو کہ مخالف پارٹی کو کس طرح زیادہ سے زیادہ زک پہنچائی جا سکتی ہے، خواہ اس کے لیے دوسری

پارٹیوں سے ممبر توڑ کر انھیں وزیر بنانا پڑے یا گرگٹ کی طرح سیاسی رنگ بدلنا پڑے یا پونجی پتیوں کے ساتھ ٹھیکوں کا بیوپار کرنا پڑے۔ میں اس قدر امید پرور اور خوش فہم نہیں ہوں کہ سب لوگوں سے، جو ہماری پبلک لائف کی زینت ہیں، دیانت داری اور جرأت کی توقع رکھوں۔ لیکن دل چاہتا ہے کہ کچھ تو بندگان خدا ایسے ہوں جو اپنی مثال اور اثر سے قوم کے ذہن میں انقلاب پیدا کر سکیں۔ وہ قید و بند اور سولی کی آزمائش کے لیے تیار نہ ہوں۔ لیکن اس راہ میں کم سے کم اپنے عہدوں اور کرسیوں کی بازی تو لگا دیں۔ کوئی گاندھی تو ہو، کوئی ونوبا بھاوے تو ہو، کوئی جواہر لال تو ہو، کوئی آزاد تو ہو جو جھوٹ اور انیائے اور ہنسا اور انیاچار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکے: "تم [illegible] باطل ہو۔ ہم تمھارے ساتھ معاملہ نہیں کریں گے۔ ہم نے جس ہندستان کا، جس دنیا کا خواب دیکھا ہے اس میں آخری کامیابی تمھاری نہیں ہوگی۔ اس میں تمھاری حکومت نہیں چلے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ استیہ سے ستیہ بہتر ہے۔ ظلم سے رحم بہتر ہے۔ ہنسا سے اہنسا بہتر ہے۔" مگر ایسے لوگ کہاں سے آئیں گے اگر ہمارے سکول اور کالج اور یونیورسٹیاں ان کی تربیت کی ذمہ داری نہ لیں؟ جب نمک کی نمکینی جاتی رہے گی جیسی آج کل جا رہی ہے تو ہمارا قومی جیون کس طرح نمکین بنایا جا سکتا ہے۔ ملک میں آج کل ایک طوفان بپا ہے، آندھیاں چل رہی ہیں، تعصب اور تنگ دلی ہماری زندگی پر چھاپہ مار رہے ہیں (خواہ مصلحت کی وجہ سے یا لوگوں کو بے خبر رکھنے کے لیے ہمارے بعض نیتا اس پر پردہ ڈالنے کی یا اس کو کم کر کے دکھانے کی کوشش کریں)۔ اس ہل چل میں کہیں کوئی سکون کے مرکز ایسے بھی ہونے چاہئیں جہاں بیٹھ کر، اور ...کوئی چراغ ایسے روشن ہونے چاہئیں جن کی روشنی میں کم سے کم ملک کے استاد اور طالب علم سچ اور جھوٹ، صحیح اور غلط، نیائے اور انیائے میں تمیز کرنا سیکھیں۔ میں طلبہ کو سیاست سے جدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اس کا سنجیدگی اور گہرائی سے مطالعہ کریں۔ لیکن یہ جانتا ہوں کہ اگر ان کے دل و دماغ کی تربیت کیے بغیر انھیں منجدھار میں پھینک دیا گیا تو اس میں ڈوب جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ زمانہ سوچ کا ہے، غور و فکر کا ہے، علم حاصل کرنے کا

ہے، دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا ہے، یہ طے کرنے کا ہے کہ جب وہ ملک کے ذمہ دار ناگرک بنیں گے تو کیا کریں گے۔ اس سوال کا جواب سوچنا اور جواب دینا تو آپ کا کام ہے۔ یہاں حالی کا وہ جواب سن لیجئے جو انھوں نے تقریباً سو سال پہلے دیا تھا۔ زبان سیدھی سادی ہے، شاید روکھی پھیکی ہے، لیکن زندگی کی بنیادی حقیقتیں نہ نئی ہوتی ہیں نہ رنگین۔ وہ تو محض حقیقت ہوتی ہیں۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ — لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی — جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی

ڈاکٹر محمد عمر

غالب کا عہد

غالب ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت دہلی کے تخت پر نابینا بادشاہ شاہ عالم ثانی (متوفی ۱۲۲۱/۱۸۰۶ء) جلوہ افروز تھا۔ اُن کے دادا قوقان بیگ خاں، شاہ عالم ثانی کے عہدِ سلطنت میں سمرقند سے دہلی آئے اور پچاس گھوڑوں اور نقارہ نشان کے ساتھ بادشاہ کے نوکر ہوئے تھے۔ پہاسو کا پرگنہ جو بعد میں بیگم سمرو کو عطا ہوا تھا، پہلے ان ہی کو دیا گیا تھا۔ غالب کے والد عبداللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کی سرکار میں ملازم ہوئے اور چند دنوں ملازمت کرنے کے بعد وہاں سے حیدر آباد پہنچے اور نواب نظام علی خاں کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ کئی برس وہاں رہے۔ مگر ریاست کے حق داروں کی خانہ جنگی کی وجہ سے وہ نوکری جاتی رہی۔ لہٰذا وہاں سے وہ الور آئے اور راؤ راجہ بختاور سنگھ کے دامنِ دولت سے منسلک ہو گئے اور راجہ کی خدمت کرتے ہوئے ایک جنگ میں لڑتے ہوئے کام آئے۔ والد کی وفات کے زمانہ میں غالب کی عمر صرف پانچ چھ سال کی تھی اور وہ بدیں وجہ خود کفیل نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا ان کے چچا، نصراللہ بیگ خان نے، جو اس زمانے میں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے، غالب کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ ۱۸۰۳ء میں جب انگریزوں نے جنرل لیک کی پیشوائی میں اکبر آباد پر حملہ کیا تو نصراللہ بیگ خاں نے اپنے میں طاقتِ مقاومت نہ دیکھی، وہ صوبہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اور ان کی اطاعت قبول کر لی۔ اس وفاداری کا لحاظ کرتے ہوئے جنرل لیک نے نصراللہ بیگ کو انگریزی سرکار

میں ملازم رکھ لیا اور چار سو سواروں کا سردار مقرر کر دیا۔ ایک ہزار سات سو روپے تنخواہ مقرر کر دی۔ بعد ازیں جب نصر اللہ بیگ نے اپنے زور بازو اور سیاسی تدبر سے سونک اور سونسا کے دو پرگنے جو بھرت پور ریاست سے متعلق تھے، ہولکر کے سواروں سے چھین لیے تو خوش ہو کر انگریزوں نے یہ دونوں پرگنے بھی بطور استمرار انھیں دے دیئے۔ اس واقعہ کے دس ماہ بعد ہی اچانک ہاتھی سے گر کر خان موصوف کی وفات ہو گئی۔ اس وقت غالب کی عمر ۹ سال کی تھی۔ چچا کی جاگیر نواب احمد بخش خاں کو منتقل ہو گئی مگر غالب اور ان کے شرکائے حقیقی کے لیے دس ہزار روپے مقرر ہوئے مگر وہ انھوں نے نہیں دئے۔ صرف تین ہزار روپے سال ملے۔ اس رقم میں سے غالب کی ذات کے لیے ساڑھے سات سو روپے سالانہ طے ہوئے۔

۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو غالب کی ولادت آگرہ میں ہوئی۔ اور تیرہ برس کی عمر تک وہ وہاں رہے۔ شادی کے بعد دہلی چلے آئے۔

اور پھر آخری دم تک دلی کے دامن سے لپٹے رہے۔ اور وہیں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اور نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے جوار میں مدفون ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر اکہتر برس کی تھی۔

اس طرح غالب نے اپنی اکہتر سالہ زندگی میں ۱۳ برس آگرے میں اور ۵۸ سال دہلی میں گذارے۔ لہذا غالب کے کلام اور خطوط، خیالات، تصورات، عادات و اطوار کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہم آگرہ اور دہلی کے سیاسی اور سماجی ماحول کا مطالعہ کریں کیوں کہ غالب نے ان حالات میں نشو و نما پائی تھی، ان کی زندگی ان حالات کے گرداب میں گذری تھی اور بدیں وجہ غالب کے کلام میں، وہی کرب اور دلسوزی کی تصویر نظر آتی ہے جو ہم میر تقی میر کے کلام میں پاتے ہیں۔ کیونکہ اگر میر کا عہد سیاسی، سماجی، اخلاقی لحاظ سے زوال و انحطاط، اقتصادی زبوں حالی اور سیاسی طوائف الملوکی کا دور تھا تو اس لحاظ سے غالب کا دور بھی مختلف نہیں تھا۔ اگر میر نے نادر شاہی حملہ اور ابدالی فوجوں کی تاخت و تاراج سے دلی

کی بربادی دیکھی تھی جن میں خود ان کا گھر بھی لٹا اور منہدم ہوا تھا اور وہ آوارۂ دشت و بیاباں پھرے تھے تو غالب نے بھی غدر کے مظالم، خونریزی، لوٹ مار اور چیرہ دستیاں اور تم انگیزیاں دیکھی تھیں، جو نادری اور ابدالی حملوں کی قیامت خیزی سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ غالب نے اپنی آنکھوں سے نہ صرف سلطنت مغلیہ کا انحطاط اور زوال پذیری دیکھی تھی بلکہ اس کا اختتام بھی۔

سیاسی و اقتصادی حالات

اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے مغلیہ سلطنت کے زوال، انحطاط اور طوائف الملوکی کی جو داستان شروع ہوتی ہے وہ اس خاندان کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کی معزولی کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ ایک طرف تو خانہ جنگیوں اور دوسری طرف امرا کی کامجوئیوں نے اندرونی سیاسی طاقتوں، مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں، روہیلوں کو ابھرنے کا موقع بہم پہنچایا اور ساتھ ساتھ بیرونی حملہ آوروں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ ان تمام سیاسی طاقتوں نے اس مغلیہ سلطنت کے شیرازے کو بکھیر دیا جس کے سطوت اور شوکت کا غلغلہ ایک طرف کابل اور قندھار تک، دوسری طرف کشمیر اور بنگال تک اور تیسری طرف راس کماری تک سنائی دیتا تھا۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں بادشاہ کی بے بسی اور اضطرار کی کیفیت یہ ہو گئی جیسے کوئی خزاں زدہ پتا ہوا کے نظر کرم کا ملتجی ہو۔ اور ہوا جس طرف چاہے اڑا لے جائے۔ ایک وسیع سلطنت سمٹ کر لال قلعہ کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ تمام علاقے دوسروں کے قبضے میں جا چکے تھے اور شاہ عالم کی سلطنت از دہلی تا پالم رہ گئی تھی۔

شاہ عالم ثانی مرہٹوں کے قبضے میں تھا۔ میر کا بیان ہے کہ مرہٹوں نے:

> "قلعہ کو جاٹوں کے حوالے کر دیا۔ اب سو روپے روز بادشاہ کو دیتے ہیں اور تمام ملک پر متصرف ہیں۔۔۔۔ اب مرہٹہ (سیندھیا) بادشاہ ہے جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ رنگ کب تک رہے گا۔"[1]

---

[1] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۹۱

مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر انگریز خاموش نہ بیٹھ سکے۔ جب دوسرے جھگڑوں سے ان کو نجات مل گئی تو انھوں نے دلی کی طرف توجہ کی اور لارڈ لیک کی سرکردگی میں ایک انگریزی فوج بھیج کر دلی پر حملہ کر دیا اور ۱۸۰۳ء میں شہر پر قبضہ کر کے مرہٹوں کو مار بھگایا، اور بادشاہ کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اب انگریزوں نے بادشاہ کی ایک لاکھ پنشن مقرر کر دی اور اُسے قلعہ میں بے کسی اور بے بسی کی زندگی گزارنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اس مجبوری اور اقتصادی زبوں حالی میں شاہ عالم نے ۱۸۰۶ء میں رحلت فرمائی۔

شاہ عالم کے بعد ان کا لڑکا اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھا۔ مگر روایت کے مطابق سلطنت دہلی سے پالم تک ہی محدود رہی اور اگر یہ کہا جائے کہ لال قلعہ کے باہر نہ تھی تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بادشاہ نے اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے تیس لاکھ روپے سالانہ کا مطالبہ کیا اور راجہ رام موہن رائے کو بسلسلۂ پیروی لندن تک بھیجا لیکن تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ بادشاہ کی ساکھ اس قدر گر چکی تھی کہ مہاجن اور ساہوکار تک اسے قرض دینے کو راضی نہ ہوتے تھے۔ اور شاہی خاندان کے افراد کو تین تین دن کے فاقے کرنے پڑتے تھے۔ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں:

> "اکبر شاہ اگرچہ تخت نشیں ہوئے مگر اخراجات کی تنگی کا وہی عالم تھا جو شاہ عالم کے وقت میں تھا۔ شاہ عالم کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی۔ تمام کارخانے ابتر تھے شاہزادوں کو جو تسعہ کے نو محلے میں رہتے ہیں، ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا۔ وہ چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکے مرتے ہیں، بھوکے مرتے ہیں۔"

اکبر شاہ کی وفات کے بعد ان ہی حالات میں بہادر شاہ ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھا مگر یہ صرف نام کی سلطنت تھی۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے ایک مورّخ رقمطراز ہے:

> "بجز نام سلطانی اختیار ندارد وہمہ ملک در قبضۂ انگریزاں است"

۱۸۰۳ کے بعد انگریزوں نے رفتہ رفتہ اپنے اختیار بڑھانے اور نظم ونسق میں پوری

طرح سے دخیل ہونے کی کوشش شروع کردی تھی اور ان کے پیر اتنے جم چکے تھے کہ اب انھیں حکومت کرنے کے لیے مغل بادشاہ کی آڑ لینے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ لہٰذا ۱۸۳۲ء میں دلی صوبہ مغربی اور شمالی صوبے میں شامل کر دیا گیا، ۱۸۳۵ء میں کمپنی بہادر نے اپنا سکہ بھی جاری کردیا اور مغل بادشاہ کا نام تک خارج کر دیا۔

بہادر شاہ کی زبوں حالی کا اندازہ اس زمانے کے اخبارات اور دوسرے ذرائع سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ انھیں ایک لاکھ روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی جبکہ ان کے اخراجات اس آمد سے کہیں زیادہ تھے۔ چنانچہ ہر وقت مالی پریشانی میں مبتلا رہنا پڑتا تھا، اور وقتاً فوقتاً ساہوکاروں سے قرض لے کر کام چلانا پڑتا تھا۔ انھوں نے میر حامد علی خاں، حافظ داؤد خاں، لالہ زورآور چند اور چند دیگر حضرات سے قرض پر روپیہ لیا تھا۔ اسپیر نے لکھا ہے کہ ۱۸۴۶ء میں قرض کی یہ رقم ۵ لاکھ روپے تک پہونچ چکی تھی۔ قرض دہندوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس بنا پر بادشاہ کی عزت اور وقار لوگوں کی نظر سے روز بروز گرتا جاتا تھا۔

اس معاشی تنگی کی ایک بڑی وجہ شاہ خرچی تھی۔ منشی فیاض الدین نے دہلی کے آخری دو بادشاہوں اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے طرزِ معاشرت کی جو تصویر اپنی کتاب بزمِ آخر میں پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لال قلعہ میں ہر دن عید اور ہر شب، شبِ برات تھی۔ سارا سال درباری جشن اور تہواروں کے انعقاد میں گذرتا تھا۔ کبھی تورے بندی، کبھی رتجگا، کبھی نوروز، کبھی آخری چہار شنبہ، کبھی خواجہ صاحب کی چھڑیاں، کبھی سلونوں، کبھی پھول والوں کی سیر، کبھی جشن سالگرہ، کبھی محرم کا جشن، کبھی بارہ وفات کا جلسہ، کبھی گیارہویں حضرت غوث الاعظم، حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی سترھویں کا عرس، مدار شاہ کی چھڑیاں، خواجہ صاحب کی چھڑیاں، کبھی شبِ برات، رجب میں شاہ مدار کی نیاز، دسہرہ، ہولی، اور دیوالی وغیرہ، ہزارہا جشن تھے۔ اور اسی طرح تمام رسمیں ولادت سے لے کر وفات تک تمام شہزادوں کی منائی جاتی تھیں۔

سلطنت مغلیہ کی اس سیاسی کمزوری اور اقتصادی بدحالی کا اثر عوام پر پڑتا تھا کیونکہ عہد مغلیہ کے اقتصادی نظام کی بنیاد ایسے اصولوں پر تھی کہ تمام پیشہ ور طبقوں کی آمدنی کا انحصار شاہی خاندانوں کے افراد اور شاہی ملازمین پر تھا کیونکہ وہ نہ صرف ان پیشہ وروں کی سرپرستی کرتے تھے بلکہ ان کی تیار کردہ اشیاء کے سب سے بڑے خریدار بھی تھے۔ جب شاہی افراد اور ملازمین شاہی ٹکڑوں کو محتاج ہو گئے تو ان بیچاروں کی بدحالی کا کیا کہنا۔ ریاستوں کے الحاق سے یہ ڈھانچہ بکھر گیا۔

کمپنی بہادر کو ہندوستانیوں کی رفاہِ عام سے کوئی غرض نہ تھی وہ تو اپنا الو سیدھا کر رہے تھے اور ہندوستانیوں کو اقتصادی حیثیت سے تباہ کر کے اپنے ملک انگلینڈ کو مالا مال کرنا چاہتے تھے مصحفی (متوفی ۱۲۴۰/۱۸۲۴ء) نے ایک شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا:

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

حالاں کہ اُس زمانے میں دہلی ہر قسم کی صنعت و حرفت کا مرکز تھا لیکن انگریزی حکومت کے ورود سے تجارت پیشہ اور دستکاروں کی کمر ٹوٹ گئی۔ انگریزوں کا مقصد ہندوستان کی تجارت اور صنعت و حرفت کو ایک سرے سے ختم و تباہ کرنا تھا۔ وہ ہندوستان سے کچا مال اپنے ملک کو بھیج کر وہاں سے تیار شدہ مال درآمد کر کے یہاں بہت گراں فروخت کرتے تھے اور خوب منافع کماتے تھے لہٰذا انھوں نے ایسی پالیسی اختیار کی کہ جس سے ہندوستانی پیشہ ور تباہ ہو کر مفلوج ہو جائیں، اور رفتہ رفتہ ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ خود بخود یہاں کے تاجر اور صناع میدان چھوڑ جائیں اور آخر میں یہی ہوا۔ ڈھاکہ کی ململ دنیا بھر میں مشہور تھی اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی اس صنعت سے روزی پیدا کرتے تھے لیکن ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء کے درمیان ان کی تعداد گھٹ کر کل بیس ہزار رہ گئی تھی۔ یہی حال شمالی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کا ہوا تھا۔ ہر جگہ اہلِ حرفہ اور صنّاع بے روزگاری اور مفلسی کا شکار تھے۔ مشہور شعر ہے:

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بُرا اُس میں جسے کچھ ہنر آوے

علامہ فضل حق خیر آبادی کے ایک خط سے اس زمانے کے معاشی حالات کا بڑا دردناک منظر سامنے آتا ہے:

"اس ملک کے باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ ان میں کچھ کسان اور کچھ کاشتکار ہیں، کچھ روزگار پیشہ، کچھ تاجر اور اہل حرفہ، کچھ لوگ خراجدار اور روزینہ دار ہیں۔ کچھ کی معاش محض دریوزہ گری پر ہے..... جب تک ہندوستان کی حکومت بادشاہوں اور راجاؤں کے تصرف میں رہی اس وقت ملک کے باشندوں کو معیشت کی کوئی تنگی نہ تھی۔ مگر جب سے انگریزوں کی عملداری ہوئی ہے، اس وقت سے بتدریج معاش کی تنگی اور روزگار کا فقدان اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عوام کی حالت تباہ ہوگئی ہے کیونکہ انگریز سرکار کے زمانے میں معاش کے سارے وسائل مفقود ہیں۔ چناں چہ اس شہر کے باشندوں کا حال اور یہاں کے تاجروں کی کیفیت یہ ہے کہ کفار انگریز نے تجارت کے سارے گُر اپنے ہاتھوں میں رکھے ہیں اور تمام اجناس مثلاً سوتی برتن، گھوڑے اور دوسرے مویشی وغیرہ ملک انگلستان سے لاتے ہیں اور اس ملک کے ہر ہر شہر اور گاؤں میں فروخت کرکے خود نفع کماتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کو نفع اندوزی کا کوئی موقع نہیں دیتے۔ اس لیے ہمارے ملک کے تاجر اپنے پیشوں سے دست بردار ہوگئے ہیں۔"

اس کے علاوہ معافی داروں کی زمینیں اور جاگیر داروں کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور سب طرح سب لوگ بے روزگار ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اہل حرفہ کو اپنی صنعت سے ہاتھ دھونا پڑا کیوں کہ ان کے مال کی کھپت زیادہ تر ان ہی لوگوں کے ہاں ہوتی تھی۔ ان تمام باتوں کا اثر یہ ہوا کہ سارا ہندوستان بالعموم اور مسلمان بالخصوص معاشی تنگی میں گرفتار ہوگئے۔ اس طرح دہلی

اور آگرہ کے اہل حرفہ اور ساہوکار عوام کی بے بضاعتی کے باعث نفع اندوزی سے محروم ہو گئے اور جو کچھ اور سرمایہ ان کے پاس تھا کھا پی کر برابر کر دیا اور اپنے دوالے نکال دیے۔

معاشی تنگی کا یہ عالم تھا کہ صناع کاسۂ گدائی لیے پھرتے تھے اور عوام معمولی سی اجرت پر نوکری قبول کر لیتے تھے۔ "بہت سے آدمی صرف آنہ یا ڈیڑھ آنہ یومیہ پر نوکر ہوتے تھے اور بہت سے آدمی بعوض یومیہ کے سیر ڈیڑھ سیر اناج پاتے تھے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ہندستان کی رعایا جیسی نوکری کی خواہشمند تھی ویسی ہی مفلسی اور ناداری سے محتاج اور تنگ تھی"

دربار کے ملازمین کی حالت تو ناگفتہ تھی۔ شیخ ابراہیم ذوق جو بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ چار روپے ماہانہ پر ملازم ہوئے تھے جو بعد میں بڑھ کر پانچ سات روپے ہو گئے تھے اور آخر میں تیس روپے ماہوار پانے لگے تھے وہ رقم بھی وقت پہ نہ ملتی تھی۔ اس وجہ سے ہمیشہ افسردہ اور رنجیدہ رہتے تھے۔

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس تجھ پر اے کمال افسوس ہے

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے غالب اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں دہلی آئے۔ ابتدا میں وہ اپنی آمدنی پر ہی گذارہ کرتے رہے اور نواب احمد بخش خاں کی خیانت کے خلاف انگریزی سرکار سے شکایت کرتے رہے۔ مگر کوئی تسلی بخش نتیجہ نہ نکلا۔ مگر کوشش جاری رہی۔ ۱۸۵۰ء میں دربار دہلی سے ان کی وابستگی ہو گئی اور ان کے لیے پچاس روپے ماہوار مقرر ہوئے۔ ولی عہد کی طرف سے چار سو روپیہ علاوہ ازاں۔ مگر دو سال کے بعد ولی عہد کا انتقال ہو گیا اور وہ آمدنی بھی بند ہو گئی۔ دہلی کے علاوہ دربار لکھنؤ سے ان کو "بہ صلہ مدح گستری" پانچ سو روپے سالانہ مقرر ہوئے تھے۔ مگر یہ وظیفہ بھی دو سال تک جاری نہ رہ سکا اور واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد بند ہو گیا۔ مگر دربار دہلی سے بدستور پچاس روپے ملتے رہے۔ ۱۸۴۲ء میں غالب لبلسلۂ اجرائے پنشن کلکتہ گئے۔ وہاں وہ گورنر جنرل سے ملے۔ ان کی قدر ہوئی اور سات پارچہ جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید مع تین رقم کا خلعت ملا۔

بہادر شاہ ظفر نے ۴؍ جولائی ۱۸۵۰ء کو غالب کو نوکر رکھا اور خطاب سے نوازا۔ سلاطین تیموریہ کی تاریخ نگاری کی خدمت ان کے ذمے ہوئی۔ غالب نے ۱۸۵۴ء میں اس تاریخ کا پہلا حصہ لکھ ڈالا اور اس کا نام "مہر نیم روز" رکھا اور دوسرا حصہ جس کا نام غالب نے "ماہ نیم ماہ" تجویز کیا تھا غدر کی وجہ سے تکمیل نہ پا سکا۔

اپنی تنگدستی، مصائب و آلام کو غالب نئے نئے انداز سے بیان کرتے ہیں:

"یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے جو دکھ مجھے پہونچتا ہے، کہتا ہوں کہ "غالب کے ایک اور جوتی لگی۔" بہت اتراتا تھا کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا مردود مرا، بڑا الحدمرا، بڑا اکافر مرا، ہم نے ازراہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو لوگوں نے "جنت آرامگاہ" اور "عرش نشیمن" خطاب دئے ہیں چوں کہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہ قلمرو سخن جانتا تھا "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے "آیئے نجم الدولہ بہادر" ایک قرضخواہ کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضخواہ بھوگ سنا رہا ہے۔ بس ان سے پوچھ رہا ہوں، "اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو" بولے کیا بے حیا، بے عزت کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لئے جاتا تھا، یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا۔"

تھوڑے دنوں بعد بادشاہ نے قلعہ کے ملازمین کی تنخواہ ماہ بہ ماہ کے بجائے چھ ماہی کر دی۔ غالب کو اس سے بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور انھوں نے اپنی ضروریات اور مالی مشکلات کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا اور عرضی بادشاہ کی خدمت میں بھیجی:

میری تنخواہ جو مقرر ہے اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اس چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بہ قیدِ حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا ہو گیا ہے شریک ساہوکار

اور آخر میں مدعا بیان کرتے ہیں :

میری تنخواہ کیجیے ماہ بہ ماہ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

غالب اور غدر

ایسی کئی باتیں[1] اندر ہی اندر پھوڑے کی طرح پکتی رہیں اور آخر میں لاوا "تحریکِ آزادی" کی صورت میں پھوٹ نکلا۔ ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کے تلنگوں نے آزادی کی جنگ کا اعلان کر دیا۔ لوٹ مار کے ذریعے انگریزوں سے سامانِ حرب حاصل کر کے دلی کا رخ کیا۔ آزادی کے پرد اپنے سپاہی گروہ در گروہ کشمیری دروازے، دلی دروازے اور راج گھاٹ سے "دین دین" کے نعرے لگاتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے اور دہلی میں بھی "تحریکِ آزادی" پھیلا دی۔ یہ سوار لال قلعہ کے جھروکے کے نیچے آئے۔ ان میں بعض کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں اور بعض پستول اور کارتوس لیے ہوئے تھے۔ ان سواروں نے باقاعدہ بادشاہ کو سلامی دی اور شور و غل مچانا شروع کر دیا۔ "دہائی بادشاہ سلامت کی" ہم دھرم کی جنگ میں مدد کے طلبگار! انھوں نے اپنی خدمات انگریزوں کی مکاریاں اور چال بازیاں، میرٹھ کے حالات اور کارتوسوں کا واقعہ مفصل بادشاہ کو سنایا بہادر شاہ ظفر نے کہا :

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند۔

"سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، میں تو فقیر ہوں، ایک تکیہ بنائے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں! بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ سلطنت تو سو لہ برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی ۔ ۔ ۔ میرے پاس خزانہ نہیں ہے کہ تم کو تنخواہ دوں فوج نہیں کہ تمھاری مدد کر سکوں، ملک نہیں کہ تحصیل کے لیے نوکر رکھوں۔"

مگر سپاہیوں نے کہا کہ انھیں خزانہ نہیں چاہیے، رہنمائی اور پیشوائی چاہیے۔ یہ تجویز بادشاہ نے قبول نہ کی۔

مگر یہ "تحریک آزادی" ناکام ثابت ہوئی، اور بہادر شاہ ظفر کو شکست کھانی پڑی۔ آزادی کے دیوانے انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے، حالانکہ انھوں نے کامیابی حاصل کرنے کی جدوجہد میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ دہلی شہر پہ انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ بے گناہوں پر مظالم اور تشدد کے دروازے کھول دیے گئے اور ہزاروں کی تعداد میں ساکنان دہلی نے جام شہادت نوش کیا اور لاکھوں شہر سے نکل کر دوسری جگہ چلے گئے۔

بہادر شاہ ظفر کو قید کر لیا گیا۔ شہزادوں کو گرفتار کر کے، رتھوں پر سوار کر کے دہلی دروازے تک لایا گیا اور وہاں انھیں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ بعد ازیں شہزادوں کے سر کاٹ کر بادشاہ کے سامنے لائے گئے۔ لاشوں کو کوتوالی کے دروازے پر آویزاں کر دیا گیا اور سر جیل خانے کے سامنے خونی دروازے پر لٹکا دیے گئے جن کو ہزاروں آدمیوں نے نگاہ عبرت سے دیکھا۔ یہ شہزادے تھے۔ مرزا مغل، ابوبکر، خضر سلطان، مرزا غلام الدین اشکی، مرزا رحیم الدین ایجاد، مرزا تیمور رفعت، مرزا عزیز الدین سرور، مرزا ابختاور شاہ شاکی، مرزا غیاث الدین شرر، مرزا قمر الدین شیدا۔

اس کے بعد انگریزوں نے سارے ملک کو بالعموم اور دہلی کو بالخصوص انتقام کی آگ میں جھونک دیا۔ اور قتل و غارت گری اور عصمت دری کا وہ ہنگامہ برپا کیا جس کی مثال اگر مل سکتی ہے تو تیموری اور نادری قتلِ عام ہیں مل سکتی ہے۔ دہلی کے عام باشندوں اور شاہی خاندان کے افراد

کو بڑی بے دردی اور بے رحمی سے چن چن کر تہ تیغ کیا۔ صرف کوچۂ چیلان کے تقریباً چھ سو آدمی مارے گئے جن میں مولانا صہبائی اور ان کے دو بیٹے مولوی عبدالکریم اور مولوی عبدالعزیز بھی شامل تھے۔ ہندوستان کے مشہور خوش نویس میر پنجہ کش بھی بے گناہ قتل ہوئے۔

دہلی پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے سات روز تک شہر میں لوٹ مار، قتل اور غارتگری اور بربریت کو روا رکھا۔ اور یہ "قتل عام" نادری سے کئی ہزار گنا بڑھ کر تھا۔ اس حقیقت کا اقرار خود انگریزوں نے کیا ہے۔

چاندنی چوک میں پھانسیاں نصب تھیں روزانہ سیکڑوں بے گناہ پکڑ کر لائے جاتے اور بلا تحقیق اور تفتیش ان کے لیے پھانسی کا حکم ہوتا اور ان مظلوموں کو قطار میں کھڑا کر کے یکے بعد دیگرے پھانسی دیدی جاتی۔ حالانکہ یہ کام بڑی پھرتی سے ہو رہا تھا اور تین ماہ تک روزانہ آٹھ گاڑیاں لاشوں سے بھر کر روانہ کی جاتی تھیں پھر بھی مزید سختی کا مطالبہ زوروں پر تھا۔ گولیوں سے ہلاک کئے جانے والوں اور پھانسی پانے والوں میں بے شمار عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان، اپاہج اور معذور لوگ بھی شامل تھے

شمالی ہندوستان میں سیکڑوں نے بھوک اور پیاس سے جان دیدی اور کتنے ہی بے بسوں اور مصیبت کے ماروں نے خودکشی کر لی تھی۔ ہزاروں عورتوں نے کنوؤں میں کود کر جان دیدی تھی اور اس طرح بے شمار کنویں اِن زندہ لاشوں سے اٹ گئے تھے۔ بازاروں کا عالم یہ تھا:

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

لوگوں میں ہراس اور خوف کا یہ عالم تھا کہ انگریزوں کے نام سے کانپتے تھے۔ غالب نے ایک رباعی میں اس حالت کو بیان کیا ہے:

جائیکہ ستارہ شوخ چشمی ورزد — افسر افسار گر زن ارزن ارزد
خورشید ز اندیشۂ جا در گردش — بر چرخ نہ بینی کہ چساں می لرزد

ایامِ تحریکِ آزادی میں غالبؔ دہلی ہی میں قیام پذیر تھے۔ نہ تو ان کا گھر لٹا اور نہ وہ قید ہوئے مگر اس حادثہ سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ بلاتخصیص مذہب و ملت، دہلی کے باشندوں پر مظالم توڑے گئے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کے بہت سے محبوب دوست، رفیق، ہمدرد اور ہم نشین بھی اس حادثہ میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

انگریزوں کی چیرہ دستیوں اور زیادتیوں کے علاوہ دہلی کے رہنے والوں کو دوسری مصیبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ غالبؔ نے لکھا ہے:

"پانچ لشکروں کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و مکان و آسمان و زمین و آثارِ ہستی لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرگئے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے، پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔ مرے آدمی کم، لیکن جس کو تپ آئی اس نے اعضاء میں طاقت نہ پائی

ہندوستان سایۂ گُل پائے تخت تھا — جاہ و جلال عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

ہر داغ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے — عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ آہ

دردِ جدائیٔ اسد اللہ خاں نہ پوچھ"

برسات اور اکال کا ذکر کرتے ہوئے غالبؔ لکھتے ہیں:

برسات بھر مینھ نہیں برسا، آب شبینہ و کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے، میوہ کے مول اناج بکتا ہے، ماش کی دال ۸ سیر، باجرا ۱۲ سیر گیہوں ۱۳ سیر، چنا ۱۶ سیر، گھی ۱½ سیر، ترکاری مہنگی۔"[1]

---

[1] عودِ ہندی، ص ۸۳، اردوئے معلیٰ ص ۱۳۳، ۱۴۷، ۱۵۰

دلّی کی تباہی

تحریک آزادی اور اس کے بعد دہلی کی تباہی کے بارے میں غالبؔ لکھتے ہیں :

"بھائی کیا پوچھتے ہو۔ کیا لکھوں ۔ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے ، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع مسجد جامع کا ، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی ، ہر سال میلہ پھول والوں کا ، یہ پانچوں باتیں اب نہیں ۔ پھر کہو دلّی کہاں ۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا ۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ر دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے ۔ دیکھئے کہاں اترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں ۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا ۔ بہادرگڑھ ۔ بلب گڑھ ، فرخ نگر ، دوجانہ ، پاٹودی ، لوہارو ، چار معدوم محض ہیں جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ ، لوہارو تحت حکومت ہانسی ، حصار پاٹودی حاضر ۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس ، دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود ۔ اہل اسلام سے صرف تین آدمی باقی ہیں ۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خاں ، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں ، بلی ماران میں سگ دنیا موسوم بہ اسد ، تینوں مردود و مطرود ، محروم و مغموم ۔ تم آتے ہو چلے آؤ ۔۔۔۔ خانچند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ ، بلاقی بیگم کے کوچہ کا ڈھینا ، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ ، غالبؔ افسردہ دل کو دیکھ جاؤ ۔ "

" شہر کا حال میں کیا جانوں پون ڈیوٹی (چنگی) کوئی چیز ہے ۔ وہ جاری ہوگئی ہے ۔ سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو ۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا ۔ حویلیاں ڈھائی جائیں گی ۔ دارالبقا فنا ہو جائے گی ۔ رہے نام اللہ کا ۔ خانچند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑھ تک ڈھےئے گا ۔ دونوں طرف پھاوڑہ چل رہا ہے ۔ "

چوک سعد اللہ، اردو بازار، خانم کا بازار، بلاقی بیگم کا کوچہ، خان دوراں کی حویلی، دریا گنج کی گھاٹی، گلیوں کا بازار، پنجابی کٹرا، دھوبی کٹرا، رام گنج، سعادت خاں کا کٹرا، رام جی داس گودام والے کے مکانات۔ شاہی درس گاہ، دارالبقا، اکبر آبادی مسجد، چوبی مسجد وغیرہ اس طرح مسمار کی گئی تھیں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :

"مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے اینٹوں کے ڈھیر پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکاں ہو جائے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں :

"اس شہر میں ہے کون جو آوے، گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں ۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔"

غالب نے لکھا ہے کہ اس ہنگامے میں چور لوٹ مار سے دولتمند ہو گئے اور مخمل و ریشم کے بستروں پر استراحت کرنے لگے مگر اس کے برخلاف روشن گھروں میں تیل بھی نہ رہا کہ چراغ جلا سکیں۔ رات کی تاریکی میں جب ان کو پیاس لگتی تو بجلی چمکنے کا انتظار کرتے رہتے تھے اور اسی روشنی میں کوزہ و پیمانہ کو دیکھ کر پانی پیتے تھے۔ جو لوگ مٹی فروخت کرنے کے لیے زمین کھودتے تھے وہ زردار بن گئے۔ قاصدوں نے خطوط لے جانے ترک کر دئے ڈاک کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ سارے قاعدے الٹ گئے، دلیر اتنے ہراساں تھے کہ وہ اپنے سایہ سے ڈرنے لگے۔ سپاہی شاہ و درویش پر حکم چلانے لگے۔ کیا یہ صورت سزاوار ماتم نہ تھی۔

اس تحریک کے فرو ہونے کے بعد دہلی والوں کو انگریزوں کی چیرہ دستیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب انگریزوں کا شہر پر مکمل قبضہ ہو گیا تو لوگوں کو بے امتیاز قتل کیا گیا۔ معزز اصحاب نے گھروں کے دروازے بند کر لیے۔ غالب بھی دروازہ بند کر کے بیٹھ رہے تھے۔ کیوں کہ شرفا کے نزدیک آبرو بچانے کا اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہ تھا۔ انھوں نے بلوائیوں کو مارنا اور چند گھروں کو جلانا روا رکھا۔ اس اظہار غیض و غضب سے سب لوگوں پر خوف طاری ہو گیا۔ بے شمار

چھوٹے بڑے، نادار و خاکسار شہر سے باہر چلے گئے۔ اور بیرون شہر کی چھوٹی چھوٹی بستیوں یا مقبروں میں پناہ لے لی۔ ان میں سے بعض مصیبتیں اٹھاتے اور سختیاں جھیلتے دوسرے مقامات کی طرف نکل گئے۔

"شہر کی تمام دوکانیں بند تھیں۔ نہ گندم فروش تھا، جس سے دانہ خریدیں، نہ دھوبی تھا جس سے کپڑے دھلوائیں، نہ حجام تھا جس سے اصلاح بنوائیں، نہ خاک روب تھا جس سے مکان صاف کرائیں۔ جب تک کوچے کا دروازہ کھلا تھا، اشیائے خورد و نوش لے آتے تھے لیکن جب دروازہ بند کر کے پتھر چن دئے گئے تو جو کچھ پاس تھا اسی پر قوت لایموت کا مدار رہ گیا۔ یہ سامان ختم ہو گیا تو دو راتیں اور دو دن بھوکے پیاسے گزارے۔"

غالب کو بھی ان مصائب کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ جب دروازہ کھلا اور گھروں سے لوگ ڈول اور مشک لے کر پانی لانے کے لیے نکلے تو غالب بھی ملازموں کے ساتھ ہو لئے۔ میٹھا پانی دور تھا اور وہاں تک پہونچنا مشکل تھا۔ مجبوراً نیم شور پانی لے کر واپس آئے۔

ان حالات میں غالب اپنی حالت یوں بیان کرتے ہیں:

"بہ درستی کہ زندانیانہ زندگی میگزرانیم نہ کس می آید کہ گفتارش بگوش خورد و خود بروں می رویم تا دیدہ دیدنیہا نگرد۔ ہر آئینہ می توانم گفت کہ گوشہائے ما کرست وچشمہائے ما کور و بیروں اراں گوگوے وکشمکش نان ما شیریں است و آب ما شور۔ روزے ابر آمد و باراں بارید، چادرے لبیتیم وخمے زیر آں نہادیم د آب گرفتیم۔ گویند ابر آب از دریا بر دارد و بر زمیں فرو بارد و دریں بار ابر گرانمایہ ... آب از چشمہ زندگی آورد و ہر آئینہ آنچہ سکندر در بادشاہی جست وندیافت ایں تلخ کام شور بہ آشام در تباہی یافت۔"

یک خط میں لکھتے ہیں:

"وہ عزت وہ ربط وضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا اب کہاں، روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔"

شہر کی ہمہ گیر ویرانی کا اندازہ غالب کی اس تحریر سے بخوبی ہو سکتا ہے:

"مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں۔ مفصل لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے، باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔"

جیسا کہ بعد میں تفصیل سے ذکر کیا جائے گا، دوران تحریک جنگ اور اس کے بعد، مسلمانوں پر بڑی سختیاں کی گئیں جنوری ۱۸۵۸ء میں ہندوؤں کو تو شہر میں آباد ہونے کی اجازت مل گئی مگر بیچارے مسلمان

"مسلمانان اور خانماں آوارہ را ازبسکہ از رستن سبزہ در و دیوار خانہ ہائے آناں سبز است ہر دم از زباں سبزۂ سر دیوان ایں نوا بہ گوش می خورد کہ " جائے مسلمانان سبز است۔"

غالب مفلوک الحال انسان تھے۔ پنشن اور تنخواہ پر گذارہ تھا۔ یہ دونوں ذرائع آمدنی غدر کے ساتھ ہی بند ہو گئے تھے۔ ان کے پاس جو اثاثہ تھا وہ انھوں نے کالے صاحب کے گھر محفوظ رکھ چھوڑا تھا۔ کالے صاحب کے گھر کے لوٹے جانے پر غالب کا یہ اسباب بھی لٹ گیا۔ لکھتے ہیں:

"کدبانوے آنکہ بہ من گو ید چیز ہائے گراں ارز از زیور و رخت ہر چہ داشت نہانی در خانہ کالے صاحب پیرزادہ فرستاد تا در آنجا در تہہ خانہ نگاہ داشتند و در بہ گل انباشتند چوں لشکر آرایان شہر را کشودند و لشکریان فرمان یغما یافتند راز داں آں راز با من در میان نہاد کار از دست رفتہ بود و در رفتن و آوردن را گنجائی نہ ماندہ۔ تن زدم وخود را بداں فریفتم کہ چوں رفتنی بود، نیک است کہ از خانہ من نہ رفت۔"

اسی طرح غالب کا کلام اور دیگر تصانیف ضائع ہوئی تھیں۔ لکھتے ہیں :

"غدر میں میرا گھر نہیں لٹا، مگر میرا کلام کیا نظم کیا نثر کیا اردو کیا فارسی میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ ضیاء الدین خاں جاگیر دار لوہارو میرے سلبی بھائی اور شاگرد رشید اور ناصر حسین مرزا صاحب ہندی و فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے سو ان دونوں کے گھر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ نواب ضیاء الدین کا کتب خانہ بیس ہزار کی مالیت کا رہا ہوگا، لٹ گیا اور ایک ورق نہ رہا۔"

ان حالات نے قدرتی طور پر غالب کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا اور اب ان کی شاعری غم ذات کی حدوں سے گذر کر غم کائنات تک پہنچ گئی، اس لحاظ سے وہ میر کے ہم نوا بن گئے۔ اور دل اور دلی کے مرثیے لکھنے لگے :

"میرا حال سوائے میرے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں بھی فرق آ گیا تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت۔ یہ کوئی نہ سمجھے میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو غم مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ انگریزوں کی قوم میں جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، ان میں میرا کوئی امیدگاہ تھا، اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست تھا اور کوئی میرا یار، اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے، ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزداروں کا ماتم دار ہو اس کی زیست کیوں کر نہ دشوار ہو جائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ایک جنم تھا کہ جس میں طرح طرح کے معاملات مہر و محبت در پیش آئے شعر کہے، دیوان جمع کئے۔ ناگاہ وہ زمانہ بلکہ نہ وہ زمانہ نہ وہ اختلاف نہ وہ انبساط، بعد چندمدت کے دوسرا جنم ہم کو ملا اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ پہلے جنم کے ہے۔ میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلی ہے اور اس محلہ کا نام بلیماران کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست بھی اس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نگاہ ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑوں میں سے کچھ گئے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا ماتم دار ہوں۔ میں مروں گا تو مجھے کون روئے گا۔"

غدر کے بعد غالب کو ہر طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزی سرکار سے خلعت ملنا بند ہو گیا کیوں کہ وہ بادشاہ کے مصاحب تھے۔ فتنہ اور فساد اور بعد آں قلعہ کی آمد و رفت بند، خلعت بند، انگریزی پنشن مسدود، اور اگر کوئی آمدنی تھی تو والی رام پور کے ہاں سے سو روپے ماہ بماہ آجاتے تھے۔ علاوہ ازیں کبھی دو سو، کبھی ڈھائی سو روپے آجاتے تھے جس سے ان کا اور ان کے متوسلین کا گذارا ہوتا تھا باوجودیکہ غالب کی آمدنی وافر نہ تھی مگر اخراجات میں فراخدلی سے کام لیتے تھے لہذا قرض پر تکیہ کرتے تھے۔ مگر غدر کے بعد ان کی پہلی جیسی ساکھ نہ رہ گئی تھی۔ اس معاشی تنگی کی وجہ سے ایک وقت ایسا آیا کہ انھیں شراب تک چھوڑنی پڑی اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ اشیائے خوردنی میں بھی نصف سامان پر اکتفا کرنا پڑا۔ غالب کا دلی میں کوئی اپنا ذاتی مکان بھی نہیں تھا۔ ہمیشہ کرایے کے مکان میں رہے۔ آخری زمانے میں جس مکان میں ...... سکونت تھی وہ بہت ہی خستہ و تباہ تھا۔ برسات کے زمانے میں بہت تکلیف اٹھانی پڑتی تھی۔

آخری زمانے میں ضعف پیری، بے مقدوری اور جسمانی امراض کی وجہ سے غالب کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی تھی لہذا اس زمانے میں وہ اکثر موت کی آرزو کرتے تھے اور دنیا سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔

غالب کے مجموعۂ کلام اور مکاتیب میں آخری زمانہ کا دلدوز حال ملتا ہے۔ ان کی زندگی مایوسیوں، بدحالیوں اور زمانہ کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے ایک ناسور بن گئی تھی جو نظم اور نثر کی صورت میں رستا رہتا تھا۔ لیکن ان کی نظم و نثر کے ذہنی کرب اور انتشار کا اندازہ اُن حالات کا گہرا مطالعہ کرنے ہی سے ہوسکتا ہے جن میں غالب جیسے حساس اور ذہین انسان نے زندگی بسر کی۔ یہ داستان کچھ ایسی طویل ہے کہ اس کا بیان اس مضمون میں ممکن نہیں ہے غالب ہی کے لفظوں میں :

سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

تعارف و تبصرہ

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے

ماہنامہ فروغ اردو ــــــ غالب نمبر

مرتبین : محمد حسین شمس علوی ، سید انصار حسین رضوی

سائز ۲۰×۳۰/۸ ، حجم ۲۸۰ صفحات ، قیمت : پندرہ روپے

ناشر : کل ہند ادارۂ فروغ اردو ۔ لکھنؤ (یوپی)

غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر بہت سے رسالوں نے اپنے خاص نمبر شائع کئے ہیں، اس جہاں تک تبصرہ نگار کی واقفیت کا تعلق ہے، سب سے پہلے "فروغ اردو" کا غالب نمبر منظر عام پر آیا ب حجم، کتابت، طباعت اور مضامین کے لحاظ سے قابل تعریف ہے، پیغامات کے علاوہ حسب ذیل ابواب پر یہ شمارہ مشتمل ہے :

(۱) احوال (۲) تنقید (۳) تحقیق (۴) فارسی (۵) مزاحیہ (یعنی مزاحیہ مضامین) (۶) مکتوبات (مجھ جو نسخہ ملا ہے، اس میں یہ حصہ جو ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے، شامل نہیں ہے، چونکہ صفحات مسلسل نہیں ہیں اس لیے اس غلطی کا امکان بہت زیادہ تھا۔) (۷) منظومات (اس میں غالب کے کلام کا انتخاب بھی ہے اور شعرا کا خراج عقیدت بھی۔) (۸) قند مکرر (مشہور تصانیف اور مضامین کے اقتباسات بغیر حوالے کے

ماہنامہ "فروغ اردو" کے ناظم اعلیٰ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے "حرف آغاز" میں زیر تبصرہ شمارہ کی خصوصیات حسب ذیل الفاظ میں بیان کی ہیں :

"اس میں جو مضامین یکجا کئے گئے ہیں، وہ مختلف سطح اور مختلف معیار ہی کے نہیں بلکہ مختلف ــــ

زاویہ ہائے نظر کا پتہ دیتے ہیں، ان کے لکھنے والوں میں نئے بھی ہیں، پرانے بھی، محقق بھی ہیں نقاد بھی، شاعر بھی ہیں عام قاری بھی، استدلالی انداز رکھنے والے بھی ہیں، تاثراتی بھی، لذت کام و دہن کے جویا بھی ہیں، رگوں میں زہر غم کا اثر دیکھنے والے بھی۔ غالب کی زندگی اور شاعری اسی نوع کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ جب رسالہ تقریباً مرتب ہو چکا تھا، اس وقت بعض عنوانات اور موضوعات کی کمی کا احساس ہوا اور اسے ہر طرح مکمل بنانے کے لئے بعض مطبوعہ تحریریں بھی شامل کر لی گئیں، تاکہ اسے ایک اہم ادبی دستاویز کی حیثیت حاصل ہو جائے۔"

اس شمارے میں آرٹ پیپر پر بہت سی تصاویر بھی ہیں، جن میں پیغام دینے والوں اور نئے مصنفوں اور مضمون نگاروں کے علاوہ، بعض قدیم مصنفوں کی تصاویر بھی شامل ہیں، مثلاً مولانا حالی، ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری، منشی مہیش پرشاد اور بابائے اردو مولوی عبدالحق۔ امید ہے کہ یہ شمارہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اور خریداروں کی سرپرستی حاصل ہو گی

علم و فن ـــــ غالب نمبر

مجلس ادارت۔ ناز انصاری، سلطان احمد، انیس الرحمٰن دہلوی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۴۴ صفحات۔ طباعت بذریعہ آفسٹ، رنگین مصور، اس شمارے کی قیمت: تین روپے، سالانہ چندہ پندرہ روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ علم و فن، ۵۱۰ ٹیا محل دہلی ۶

علم و فن ایک ادبی ڈائجسٹ ہے اور ابھی حال میں جاری ہوا ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ غالب صدی کی تقریبات کے بعد شائع ہوا ہے، اس لیے ان تقریبات سے اور ان میں شرکت کرنے والوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ مثلاً لندن کے مشہور پروفیسر رسل، اٹلی کے پروفیسر بوسانی، مغربی جرمنی کی مشہور خاتون پروفیسر شمل، چیکوسلوواکیہ کے اسکالر ڈاکٹر یان مارک وغیرہ کے انٹرویو شامل ہیں، جن سے اس شمارہ کی انفرادیت اور امتیازی شان بڑھ گئی ہے۔ اس نمبر کی ایک اور خصوصیت ہے، وہ یہ کہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے دہلی اور علی گڑھ میں غالب کی عظمت پر ایک مفید سمینار کیا تھا، جس میں مشہور ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ ان میں جو تقریریں کی گئی تھیں انھیں ٹیپ ریکارڈ کر لیا گیا تھا اور بعد میں مرتب کرکے اس نمبر میں شائع کیا گیا ہے۔ اگرچہ تقریریں میں تحریر کی خوبی پیدا نہیں ہو سکتی، مگر اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی عظمت کے بارے میں مختلف خیال کے لوگوں کی اتنی رائیں اکٹھا کر دی گئی ہیں، جو بذات خود ایک کارنامہ ہے۔

امید ہے کہ یہ غالب نمبر بھی، جو کافی خوبصورت ہے، دوسرے غالب نمبروں کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

ماہنامہ پیامِ تعلیم ـــــ سالنامہ

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی

سائز ۲۰×۳۰/۸، حجم ۱۶۰ صفحات، اس شمارے کی قیمت: دو روپے۔ سالانہ چندہ: چھ روپے۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

پیام تعلیم ایک طویل عرصے سے نکل رہا ہے اور اس کا شمار بچوں کے بہترین پرچوں میں ہوتا ہے، بلکہ اپنی سنجیدگی، شرافت اور معلوماتی مضامین کے لحاظ سے امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔

پیام تعلیم کا یہ سالنامہ بھی اپنے پچھلے سالناموں کی طرح نہایت دلچسپ کہانیوں، پرلطف ڈراموں، مزیدار نظموں اور مفید مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کے عام شماروں میں بھی اچھے اور مفید مضامین شائع ہوتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ہر گھر، ہر اسکول اور ہر کتب خانے کے لیے اس کو خریدا جائے اور بچوں اور بچیوں کو اس کے پڑھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ موقع دیے جائیں۔ (عبداللطیف اعظمی)

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۵۹	بابت ماہ مئی ۱۹۶۹ء	شمارہ ۵

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ:

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ٹیلیفون:

اڈیٹر: ۷۴۲۵۸ مینجر: ۷۴۴۷۰

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا، آیندہ سال انشاء اللہ اس کو قائم ہوئے پچاس سال ہو جائیں گے، جامعہ والوں نے یہ طے کیا ہے کہ اس موقع پر اس کا جشنِ زرّیں منایا جائے، جاننے والے جانتے ہیں کہ پچاس سال کے اس سفر میں اِس ادارہ کو کن آزمائشوں سے گذرنا پڑا، کیسے کیسے نشیب و فراز اس کی راہ میں آئے اور امید و بیم کی کتنی کٹھن منزلیں اسے طے کرنی پڑیں آفریں ہے اُن جواں ہمت بزرگوں اور دور اندیش نوجوانوں کی سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل پر جن کے ایثار و قربانی اور صبر و استقامت کی بدولت آج ہم لوگوں کو یہ موقع نصیب ہوا ہے، تعلیم کا کام خاصا مشکل اور صبر آزما کام ہوتا ہے۔ تعلیم کی دنیا سیاسی نعروں کی دنیا سے بالکل الگ ہوتی ہے، جامعہ کا یہ کارنامہ ایک نمایاں کارنامہ ہے کہ ہندوستان ایسے ملک میں جہاں اکثر ہر اچھا کام رفتہ رفتہ سیاسی بازیگری بن جاتا ہے، اس نے اپنے آپ کو سیاست سے الگ رکھا اور گمنام رہ کر تعلیم و ترقی کے مقاصد کو آگے بڑھایا، یہاں تک کہ ملک اِس کے کام کا قدرداں بن گیا اور قوم نے سمجھا کہ یہ اِس کا اپنا ادارہ ہے۔

یہاں ۱۹۷۰ء میں ہونے والے جامعہ کے جشنِ زرّیں کا ذکر کیا گیا ہے، ایسے موقع پر بعض ذہنوں میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ جشنِ زرّیں تو الگ رہا، آج خود جامعہ کے باقی رکھنے کا کیا جواز ہے، لیکن اس سوال پر جامعہ کے بہی خواہوں اور ہمدردوں کو چیں بہ جبیں ہونے کے بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے اور یہ بتانا چاہئے کہ آج تو جامعہ جیسے تعلیمی ادارے کی

اور بھی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ محض تعلیمی ادارہ ہی نہیں، ایک تہذیبی ادارہ بھی ہے، ہمارا خیال ہے کہ تعلیم کا کوئی بامقصد پروگرام بنایا نہیں جاسکتا جب تک اس کا نصب العین تہذیب وشرافت کی اُن قدروں کی خدمت نہ ہو جن سے انسانی زندگی میں حُسن اور معنی پیدا ہوتے ہیں، آغاز کار ہی سے جامعہ کے تعلیمی منصوبوں میں یہی بنیادی مقصد کارفرما رہا ہے، ہم جانتے ہیں کہ آج ہماری قوم ایک سخت قسم کے تہذیبی بحران سے دوچار ہے، ہماری ملی جلی تہذیب پر جو ہماری صدیوں کی کمائی ہے، خطرات کی یورش ہے، اِس تہذیب کی ہر علامت کے خلاف احیائی تحریکیں سرگرم عمل ہیں، ہم تعلیم کو ایک تہذیبی عمل تصور کرتے ہیں، اس لئے ہر ایسے رجحان کے مقابلہ میں مشترک تہذیب کے ترجمان کا فرض ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اسی کے ساتھ ہمیں آج کی عالمی تہذیب کی ہر چیز سے خدا واسطے کا بیر نہیں۔ آزادی، جمہوریت، سیکولر نظام اجتماعی اور لبرل ازم اس عالمی تہذیب کے بنیادی عنصر ہیں، انسانیت کا احترام، محنت مشقت دیانتداری وہ قدریں ہیں جنھیں آج اس تہذیب میں عملی طور پر نمایاں حیثیت حاصل ہے، ہماری اپنی تہذیب، ہمارا مذہب ان قدروں کا حامی ہے اور ہمیں ان کی طرف بلاتا ہے۔ جامعہ نے ہمیشہ اُس ہند و مسلم تہذیب کی ترجمانی کی ہے جس کے بغیر مشترک زندگی اور متحدہ قومیت کا ہیکل ادھورا رہتا ہے، جامعہ نے ہمیشہ اس خیال کی اشاعت بھی کی ہے کہ ذہنوں کو کھلا رکھنا چاہیئے اور عصر حاضر کی عالمی تہذیب سے تمام صحتمند عناصر لے لینے چاہئیں تاکہ ہمارے تہذیبی چشموں کا پانی صاف ستھرا اور تازہ رہے، اسی لئے جامعہ میں قدیم علوم، مذاہب کی تعلیم اور جدید علوم کے درس وتدریس کا کام ساتھ ساتھ ہوتا رہا ہے، آج کے تہذیبی بحران میں جس صحتمند رجحان کی ضرورت ہے، جامعہ کے تعلیمی نصاب، غیر نصابی سرگرمیوں اور استادوں کی تعلیمی وتربیتی کاوشوں کے ذریعہ طالب علموں میں اسی

ہندرحمان کو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہماری گنگا جمنی تہذیب اور ہماری مشترک زندگی کی ایک روشن اور زندہ علامت اُردو زبان ہے۔ جامعہ میں اردو ذریعۂ تعلیم ہے، وہ اپنی اس خصوصیت کو باقی رکھنا چاہتی ہے، لگ بھگ پچاس برس ہوئے جب جامعہ نے اپنے لئے یہ راستہ اختیار کیا تھا، اس وقت انگریزی سامراج سے مرعوب ذہنوں میں جامعہ کے اس موقف سے متعلق شبہات پیدا ہوئے تھے، ہوسکتا ہے کہ آج بھی جب ہم آزاد ہیں اور اُردو پر کڑا وقت گذر رہا ہے، بعض لوگ اسے دیوانگی سمجھیں، لیکن جامعہ والوں کو یقین ہے کہ ۱۹۲۰ء میں ان کا نقطۂ نظر صحیح اور صحتمند تھا اور آج بھی صحیح اور صحتمند ہے، حکومت ہند اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو اس پر اعتراض نہیں، ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت بڑی ہے جو اردو کو پسند کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ زبان باقی رہے اور ترقی کرے، دوسری طرف خود اردو زبان میں اتنی سکت ہے کہ اگر اردو بولنے والے اس سے بے وفائی نہ کریں تو یہ ختم نہیں ہوسکتی، جامعہ کا قطعی یہ ارادہ نہیں کہ اترپردیش میں اردو والوں نے اپنی زبان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہی سلوک وہ بھی اردو کے ساتھ کرے۔

جامعہ میں شروع ہی سے اُردو، ہندی اور انگریزی کی تعلیم ہوتی ہے، اس لسانی فارمولے پر وہ تقریباً پچاس برس سے عمل کر رہی ہے، اس طرح اس کی اُردو میں تینوں زبانوں کی خصوصیتیں شامل ہیں، یہ سیدھی سادھی، صاف ستھری اور رواں زبان ہے جس میں علمی مضامین بھی لکھے جاسکتے ہیں، اُردو اور ہندی کے طالب علم ایک دوسرے کی بات چیت سمجھتے ہیں اور اپنی تعلیم ختم کرکے جب نکلتے ہیں تو اس تہذیب کے ترجمان بن کر نکلتے ہیں جس کا چرچا ہماری بدبختی سے اب کم ہوتا جارہا ہے، جامعہ چاہتی ہے کہ اس بجھتے ہوئے چراغ

کی کو تیز کی جائے تاکہ قوم کا مستقبل درخشاں ہو۔

جامعہ میں ہندو مذہب اور اسلام دونوں کی تعلیم ہوتی ہے، آئین ہند کے نفاذ کے بعد جس کی رو سے سرکاری گرانٹ لینے والی درسگاہوں میں کسی کو لازمی طور پر مذہب کی تعلیم نہیں دی جا سکتی، اِن کے متبادل ایک اور مضمون تاریخ تہذیب عالم یا ہندوستان کے مذاہب اور تہذیب کا اضافہ کیا گیا، لیکن مذاہب کا کورس پڑھنے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہی رہی، ہندوستان کی کسی درسگاہ میں غالباً یہ صورت حال نہیں، جامعہ کے طالب علموں کو اِس سے یہ فائدہ پہونچا ہے کہ سچی مذہبیت کے ساتھ ان میں مذاہب کے احترام کا جذبہ بیدار ہوا ہے۔

جامعہ میں مذاہب کی تعلیم اور اُردو ذریعۂ تعلیم نہ ہو، تو جامعہ کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں، جامعہ ہندوستان کی مشترک ہندو مسلم تہذیب کی ترجمان نہ ہو تو جامعہ کے وجود کے کوئی معنی نہیں، جامعہ قدیم و جدید کے خوشگوار امتزاج کی حامل اور مبلغ نہ ہو تو جامعہ کی مخصوص حیثیت کا اعلان فضول ہے، جامعہ اپنی ان خصوصیتوں کو باقی رکھنے کا پکا ارادہ کئے ہوئے ہے، اور اس لحاظ سے وہ آج ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے، اسی عزم اور حوصلے کے ساتھ اور اپنی قومی و ملّی اہمیت کے پیش نظر، وہ اپنے جشنِ زرّیں کے موقع پر اپنے اُس ایمان و یقین کا قوم کے سامنے ایک بار پھر اعلان کرنا چاہتی ہے جس کا اعادہ اُس نے اپنی زندگی کے ہر نازک موڑ پر کیا ہے اور ہر بار "یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم" کا ورد کرتی ہوئی مصاف زندگی میں نئے سفر کا سامان کرتی رہی ہے۔

پروفیسر محمد مجیب

غالب پر ایک نظر[1]

میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا بہت ممنون ہوں کہ اس نے اس سمینار کا افتتاح کرنے کی خدمت میرے سپرد کر کے میری عزت افزائی فرمائی۔ میں اس عزت کا ہرگز مستحق نہیں ہوں۔ میرا اپنا مضمون تاریخ ہے اور وہ بھی اس زمانہ کی نہیں جو غالب کا زمانہ تھا۔ ادب سے مجھے دلچسپی ہے مگر میری استعداد ناکافی۔ غالب کے اشعار کا ترجمہ کرنے بیٹھا تو پتہ چلا کہ بیشتر اشعار جو بظاہر ترجمہ کے لئے موزوں تھے سمجھ میں نہیں آئے اور جو سمجھ میں آئے ان کو ادبی پوشاک دینے کے لئے انگریزی کا سرمایہ بہت ناکافی معلوم ہوا۔ میں اس وقت جو کچھ آپ کے سامنے عرض کرنے والا ہوں وہ پچھلے سال دو سال کی اس کشمکش کا خلاصہ ہے جو غالب کے مشکل اشعار نے پیدا کی اور اسے عرض کرنے کی جرأت اس لئے کر رہا ہوں کہ شاید میری سرگزشت میں ایسی باتیں بھی ہوں جنھیں صحیح ادبی ذوق رکھنے والے قابل توجہ سمجھیں۔

غالب کی سو سالہ برسی منانے کے سلسلہ میں جو کام ہوا ہے اس نے دکھا دیا ہے کہ ریاکاری کے سولہ سنگار کرنے کی بندش نہ رہے تو عقیدت کے چہرے میں کتنی کشش پیدا

---

[1] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اردو کے اہتمام میں ۱۷ مارچ کو غالب پر ایک سمینار ہوا تھا جس میں ہندوستان کے مشہور ادیبوں نے شرکت کی۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس کا افتتاح کرتے ہوئے جو خطبہ پڑھا تھا اسے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔

پیدا ہوتی ہے۔ اب غالب کی شخصیت صاف نظر آنے لگی ہے، ان باتوں کا خاصہ چرچا ہو گیا ہے
کہ وہ صوفی نہیں تھے، فلسفی نہیں تھے، عاشق مزاج تھے تو مقدمہ باز بھی تھے۔ ان کا دل
فیاضی، دوستی اور انسانی ہمدردی سے لبریز تھا تو اُن میں ہَوس بھی تھی، انھیں اپنی خاندانی
اور سماجی حیثیت کا بہت احساس تھا اور اُن میں اعزاز حاصل کرنے کی خواہش خاصی شدید
تھی، پھر بھی شہر کے جواریوں کے ساتھ چوسر کھیلنے میں تکلف نہ کرتے تھے اور ان کی زندگی
میں استقلال کی شاید صرف یہ ایک مثال ملتی ہے کہ وہ مقررہ وقت پر مقررہ مقدار میں شراب
پیتے تھے۔ ان باتوں کا چرچا ہونے کے سبب سے غالب عام لوگوں کے اپنے شاعر ہو گئے
ہیں اور ان سے وہ محبت ہو گئی ہے جو شاید پہلے بھی نہ تھی۔ اِس محبت نے ان کی عزت
اور عظمت کو دوبالا کر دیا ہے اور یہ امید کی جا سکتی ہے کہ شمالی ہندوستان کی مشترک تہذیب
کی قدر جسے سیاسی مصلحتیں اب تک گھٹا رہی تھیں پھر بڑھ جائے گی اور اس کی بنیادیں
بھی زیادہ مضبوط ہو جائیں گی۔ اس کے باوجود یہ علمی اور نفسیاتی مسئلہ ہمارے سامنے رہتا
ہے کہ جس شخص کی زندگی میں کوئی بات قابل تعریف اور قابل تقلید نہ ہو اُس کا تخلیقی کام بلند مرتبہ
کیسے ہو سکتا ہے اور اس کے کلام میں تاثیر کیسے ہو سکتی ہے۔

یہ ایک بہت پرانی بحث ہے کہ متقی کا مرتبہ خدا کے نزدیک زیادہ بلند ہوتا ہے یا تائب
گنہگار کا۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اس مسئلہ کو طے کرانے کے لئے ایک صوفی کی خدمت میں حاضر
ہوئے۔ صوفی نے کہا کہ میں اس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ آپ لوگ کل صبح
شہر کے دروازے پر جائیے اور جو پہلا شخص آپ کو راستے پر جاتا ہوا ملے اس سے یہ سوال
کیجئے۔ شاید وہ آپ کو صحیح جواب دے سکے۔ اِن لوگوں نے ایسا ہی کیا اور جو شخص انھیں
سب سے پہلے ملا اُس کے سامنے اپنی دشواری بیان کی۔ اُس شخص نے کہا کہ میں پڑھا لکھا نہیں
ہوں۔ آپ کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ مگر میں کپڑا بننے کا کام کرتا ہوں اور یہ جانتا
ہوں کہ جو تاگہ ٹوٹ جائے اور پھر جوڑا جائے اس کی مضبوطی کا اندازہ ہو جاتا ہے، جو تاگہ

نہ ٹوٹے اس کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنا مضبوط ہے۔ یہ بھی کوئی مناسب جواب نہیں ہے اور بہر حال توبہ کا اثر دیکھنے کے لئے گناہ کرنے کی دعوت دینا بداخلاقی پھیلاتا ہے۔ در اصل تقویٰ اور توبہ دونوں کا اثر ہر انسان کی طبیعت کے مطابق ہوتا ہے۔ غالباً ان عادتوں کا جنھیں غالب چھوڑنا نہیں چاہتے تھے ایک ظاہری اثر تھا اور ایک باطنی یا تحت شعوری۔ ظاہری اثر شرافت کے اُس انداز میں نظر آتا ہے جس سے وہ اپنی کمزوریوں کو بیان کرتے یا زہد اور زاہد کو یاد کرتے ہیں۔ باطنی اثر اُسی مرتبہ میں جو وہ اپنے شوق اور جنون یعنی اپنی انسانیت کو دیتے ہیں اور یاس اور ارمان کی کیفیتوں میں۔ ان کے عیب نہ بہت نمایاں تھے نہ نرالے۔ زمانہ کے معیار کے مطابق انھیں عیب نہیں کہنا چاہیئے۔ لیکن غالب کی طبیعت بہت حساس تھی اور اس کا اصل رنگ ان کی گفتگو، ان کے خطوط اور ان کی زندگی کے واقعات میں نہیں بلکہ ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔

اُن کے ابتدائی دور کا ایک شعر ہے:

کیا پوچھو ہو بر خود غلطیہائے عزیزاں
خواری کو بھی اک عار ہے عالی نسبی سے

لیکن غالباً یہ عالی نسبی کا اثر تھا کہ انھوں نے عام مذاق سے الگ اپنا راستہ نکالا کہ عالی نسبی کو دولت اور اقتدار کا سہارا نہ ملے یا ان کی وجہ سے طبیعت میں بگاڑ پیدا نہ ہو جائے تو اُس کا خیال ذہنی خودداری کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ غالب نے صرف اپنے لئے ایک نیا راستہ نہیں نکالا بلکہ ایسا راستہ بھی جس پر چلنا بہت مشکل ہو تاکہ معمولی قابلیت والے ادھر کا رُخ بھی نہ کریں:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آخری دور کا شعر ہے مگر غالب کے ابتدائی مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ سمجھ میں نہیں

آتا کہ وہ اپنا شروع کا کلام کیسی محفلوں یا صحبتوں میں سناتے ہوں گے۔ ایسے لوگ انھیں کہاں ملتے تھے جو مثلاً اس شعر کا مطلب سمجھنے کی کوشش میں اپنا دماغ کھپانے پر راضی ہوتے:

دُودِ شمعِ کشتہ گُل، بزم سامانی عبث
یک شبہ آشفتہ نازِ سنبلستانی عبث

اُردو شاعری کو اُس پستی سے بچانے کی ضرورت صرف اسی وقت نہیں تھی بلکہ ہمیشہ رہتی ہے جو عام فہم ہونے کا مطالبہ اور محاورے برتنے کی کوشش اور خواہش پیدا کرتی ہے معنی آفرینی جس کا غالبؔ کو حوصلہ تھا آسان زبان میں بھی ممکن ہے مگر عام فہم زبان کی پابندی شاعری اور شاعر کے لئے ایک بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے جب ساتھ ہی بحر، ردیف اور قافیہ اور مشاعرے میں شرکت کی شرط بھی ہو۔ یوروپی زبانوں میں ایسے کلام کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جو اعلیٰ بھی ہیں اور عام فہم بھی۔ لیکن ان زبانوں میں وہ بندشیں نہیں ہیں جو اردو شاعر کے حصہ میں آئیں۔ اِن زبانوں کے شاعروں کو نیا تصور پیش کرنے کے لئے رائج زبان میں لفظ نہ ملتا تو وہ اپنی زبان کے مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے کوئی نیا لفظ وضع کر سکتے تھے، اردو کا شاعر ایسی حالت میں مجبور ہوتا تھا کہ فارسی یا عربی کی مدد لے، بہت سے شاعروں نے ایسا کیا۔ لیکن غالبؔ کے ابتدائی دور کے کلام میں صرف فارسیت نہیں ہے۔ انھوں نے فارسی کے الفاظ اور محاوروں کو بھی انوکھے طریقوں سے برتا۔ بہت سے اشعار اور بعض پوری غزلیں ایسی ہیں جن کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اردو کی ہیں یا فارسی کی۔ ایک غزل سات اشعار کی ہے جس میں کل پانچ خالص اردو کے لفظ ہیں۔ یہ شعر نہیں کہا جا سکتا کہ اردو کا ہے یا فارسی کا۔ مگر سوچئے کہ شعر کیسا ہے:

ہزار قافلۂ آرزو، بیاباں مرگ
ہنوز محملِ حسرت بدوش خود رائی

اردو کے حسب نسب کو دیکھئے اور اس کا اعتراف کیجئے کہ اردو بولنے والے کو کچھ فارسی

ضرور آنی چاہیئے تو غالب کے ابتدائی کلام پر جو الزام فارسیت کا لگایا جاتا ہے وہ بہت بھاری الزام نہیں رہتا اور ہم پر یہ الزام ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم اُردو کے ورثہ کو گھٹا کر اس ذخیرے تک محدود کر دینا چاہتے ہیں جو روزمرہ میں برتے جاتے ہیں۔ میں نہ ایسی بات کو چھپانا چاہتا ہوں کہ میں غالب کا طرف دار ہوں نہ اس بات کو چھپا سکتا ہوں کہ طرف داری کا حق ادا کرنے کے لئے میری معلومات کافی نہیں ہیں، لیکن میں نے کبھی کبھی اردو کے تنقیدی مضامین پڑھے ہیں ان میں مجھے ایسے فارسی کے الفاظ ملے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آئے اور عام فہم ہونے کی کوشش کے آثار بالکل ملے ہی نہیں۔ جب نثر میں ایسی عبارت لکھی جا سکتی ہے جس کے الفاظ مشکل ہوں اور پڑھنے والے کو یہ احساس نہ ہو کہ کوئی نازک یا نیا خیال پیش کیا گیا ہے تو یہ صریحی بے انصافی ہے کہ غالب کے اس شعر کو مشکل سمجھ کر نظر انداز کیا جائے:

پہنِ گشتنہائے دل، بزمِ نشاطِ گردباد
لذتِ عرضِ کشادِ عقدۂ مشکل نہ پوچھ

یہ شعر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جامعہ میں کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اتفاق سے رَوش صدیقی صاحب مل گئے انھوں نے اس کا مطلب بیان کیا۔ اب اگر مطلب سمجھنے کے بعد میں کہوں کہ ایک بہت بلند پایہ شعر ہے اور ساتھ ہی زبان کا جو لطف اس میں ہے اور جو مطلب سمجھنے کے بعد متاثر کرتا ہے اُس کا بھی ذکر کر دوں تو کچھ بے جا نہیں ہے۔ مجھے وہ گھنٹے بلکہ وہ دن کبھی نہ بھولیں گے جو اس شعر کا لطف حاصل کرتے ہوئے گذرے۔ اکبر الہ آبادی کا ایک مشہور شعر ہے:

ہر چند بگولہ مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک رقص تو ہے، اک وجد تو ہے بےچین ہے برباد سہی

اسے آپ سنتے ہی سمجھ جائیں گے اور داد دیں گے لیکن اس شعر کا موضوع بگولہ ہے اور اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ بگولہ سے مراد ایک خاص قسم کی انسانی فطرت ہے جس کی شاعر کے دل میں بڑی قدر ہے اور ہم سے بھی وہ اُس کی قدر کرانا چاہتا ہے لیکن یہ شاعر کی اپنی کیفیت نہیں، اور شاید اسی وجہ

سے یہ ہماری اپنی کیفیت بھی نہیں بن سکتی۔ اکبر کے شعر کے معنی بالکل صاف ہیں۔ غالب کا شعر
احساسات کا ایک جنگل ہے جس کی گنجان جھاڑیوں اور درختوں سے آدمی ڈر نہ جائے تو
اس کے اندر گھس جانا کیف کا ایک عالم پیدا کر دیتا ہے اور یہ عالم اگرچہ غالب کے شعر کی تخلیق
ہے مگر بالکل اپنا معلوم ہوتا ہے، اس میں نہ عقل کا گذر ہے نہ عشق کا، بس اپنا جنون ہے،
اپنی آزادی، اپنا وجود۔

شاعری لطف اندوزی کا نہیں فطرت انسانی کی عقدہ کشائی کا ذریعہ ہے، اس کی
آسانیاں مشکلیں، اس کی مشکلیں آسانیاں پیدا کرتی ہیں، شاعری کیفیت کے ملکوں کی سیر ہے،
صحرانوردی اور کوہ کنی ہے، تمناؤں کی تربیت اور تہذیب ہے، شاعری جنون کا سبق دیکر
ہوش کے آداب سکھاتی ہے، جذبات کو تہہ وبالا کر کے سکون کے نقشے بناتی ہے۔

میرے نزدیک غالب کے ابتدائی دور کی سب سے نمایاں خصوصیت انسانیت کا اثبات ہے۔
یہ ڈاکٹر اقبال کی اثبات خودی نہیں۔ اس کی پشت پر اخلاقی اور روحانی مصلحتیں نہیں
ہیں، ایک آزاد انسان کی وارداتِ قلبی کے سوا کچھ نہیں۔ غالب کے لئے انسان ہونا، آگاہ
ہونا ایک دردِ بے درماں تھا۔

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب دل نہ سمجھ بلا سمجھ

لیکن اگر آپ شاعر کی خالص انسانیت کا ایسے معلم کی مصلحتوں سے موازنہ کرنے کا شوق
رکھتے ہوں جو انسانوں کے صرف ایک گروہ کو دینی اور سیاسی تعلیم دینا چاہتا تھا
تو اقبال کے "شکوہ اور جواب شکوہ" کا غالب کی اس حمد سے مقابلہ کیجئے جو ان کی
ابتدائی غزلوں میں چھپی پڑی ہے:

گدائے طاقت تقریر ہے، زباں، تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے
چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے
بہارِ حیرتِ نظّارہ سخت جانی ہے
حنائے پائے اجل، خونِ کشتگاں تجھ سے
پری بہ شیشہ و عکسِ رُخ اندر آئینہ
نگاہِ حیرتِ مشّاطہ خوں فشاں تجھ سے
طراوتِ سحر ایجادیِ اثر یک سو
بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے
چمن چمن گل آئینہ در کنارِ ہوس
امید، محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے
نیاز، پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے
جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے، آستاں تجھ سے
بہانہ جوئیِ رحمت کمیں گرِ تقریب
وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے
اسدؔ طلسمِ قفس میں رہے، قیامت ہے
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

مجھے کسی زبان میں جو میں جانتا ہوں ایسی حمد نہیں ملی ہے جو گہرائی اور لطافت میں غالبؔ کی اس حمد کا مقابلہ کر سکے اور جس میں شاعر نے اس طرح آزاد انسان رہ کر خدا کو مخاطب کیا ہو۔ اگر ہے تو عرفیؔ کی ایک حمد، مگر اس میں تلخی ہے جس سے غالبؔ کی حمد بالکل پاک ہے۔

تلخی غالبؔ کے کلام میں بھی ملتی ہے، اس شعر پر غور کیجئے:

اسدؔ سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر کہ کشتِ خشک اس کا ابرِ بے پروا خرام اس کا

سرسبزی کا سودا بیکار ہے، اول تو جو کچھ ہے اُس کا ہے ہم صرف بے بس تماشائی ہیں، پھر سرسبزی دیکھنا ہماری تقدیر میں نہیں تو ہم یہ کیوں نہ سمجھیں کہ جو رنگینی ہے وہ اس پس منظر میں ہے کہ کھیت پیاسے ہیں اور بادل جو انھیں سیراب کر سکتے تھے اُن کے اوپر سے اڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ گویا ان کا اصل منصب بے پرواخرام کی ادا دکھانا ہے ہم میں عقل ہے تو ہم سمجھ لیں گے کہ آرزوؤں میں تڑپتے رہنا ہمارا حصہ اور نظام کائنات کا اصول ہے اور اسی کو اپنی زندگی میں رنگینی پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنالیں گے۔ دیوانگی یہ بھی ہے لیکن ہمارے لئے زیادہ حسب حال۔ سودائے سرسبزی کی طرح عافیت کا ارمان بھی ایک سودا ہے کہ عافیت بھی کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی :

یک مژہ برہم زدن حشر دو عالم فتنہ ہے
یاں سراغِ عافیت جز دیدۂ بسمل نہ پوچھ

دوسرے مصرعے کا انگریزی میں میں نے جو ترجمہ کیا ہے اس سے شاید غالب کا مطلب حس کا پورا حق دیدۂ بسمل کا مروّج استعارہ ادا نہیں کرتا، زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

Both heaven and earth can in the twinkling of an eye
Dissolve into tumultuous chaos; tranquillity and peace
Are manifest only to the cold, sightless stare of death.

یہ بنی بنائی، سجی سجائی دنیا ایسا آئینہ نہیں ہے جس میں انسان اپنی شکل دیکھ سکے۔ یہاں تو وحدت الوجود کے عقیدے کے مطابق صرف خدا کی شکل خدا کو نظر آتی ہے :

ساغرِ جلوہ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک
شوق دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا

انسان یا تو شکایت کر سکتا ہے :

خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ
سرتا قدم گزارش ذوق سجود تھا

یا پھر وہ اپنی تلاش میں ایسے شور و غوغا کے ساتھ نکل سکتا ہے کہ عالمِ وجود کی بنیادیں ہل جائیں :

سراغِ آوارۂ عرضِ دو عالم شورِ محشر ہوں
پرافشاں ہے غبار آں سوئے صحرائے عدم میرا

یہی صحرائے عدم انسان اور انسانیت کا صحیح پس منظر ہے۔ یہیں شاعر کے تصورات وجود میں آتے ہیں۔ یہیں وہ سراب نظر آتے ہیں جن کا فریب کھانا انسان کی دوامی تشنہ لبی، انسانیت کی شان ہے۔

شاعر فلسفی نہیں ہوتا۔ ناصح اور معلّم نہیں ہوتا۔ اس کا دارومدار اس آزادی پر ہوتا ہے جس سے وہ اپنی ہر کیفیت بیان کرتا ہے۔ اس کی کیفیتوں کے درمیان تسلسل قائم رکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اور وہ کسی تصور کو اِس نظر سے نہیں جانچتا کہ اس کا پچھلے تصورات سے کوئی منطقی رشتہ ہے یا نہیں۔ میں نے غالب کے ابتدائی کلام سے مثالیں صرف اس نیت سے دی ہیں کہ اُن کی مختلف کیفیتوں کا اندازہ ہو جائے، ویسے اُن کا ایک شعر ہے جس میں اُس شوق کی طرف اشارہ ہے جو اُنھیں منزل بے مقام کی طرف رواں دواں رکھتا ہے اور جس میں ہمارے بہت سے سوالوں کا جواب بھی مضمر ہے :

آبلہ پیمانۂ اندازۂ تشویش تھا
اے دماغِ نارسا خمخانۂ منزل نہ پوچھ

اردو میں اس کا مطلب سمجھانے میں تکلف ہوتا ہے اِس کا انگریزی میں میں نے یہ ترجمہ کیا ہے :

The blisters on my feet proclaim my frenzied haste
How can a feeble, fearful mind conceive
What ecstasies await me at the journey's end.

غالب کے فارسی کلام کا میں نے اتنا مطالعہ نہیں کیا ہے کہ اس پر تبصرہ کرنے کی ہمت کرسکوں البتہ ایک شعر ہے جو میرے خیال میں غالب کا بنیادی نقطۂ نظر اور ان کی طبیعت کا راز عیاں کرتا ہے اس لئے کہ یہ غصہ میں مصلحت اندیشی کو بالائے طاق رکھ کر لکھا گیا تھا:

خوئے آدم دارم، آدم زادہ ام
آشکارا دم زعصیاں می زنم

اِس سمینار میں یقیناً غالب کے فارسی کلام پر مضمون پڑھے جائیں گے اور اُس غالب پر بھی جس کو مطبوعہ دیوان نے ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ مجھے اس کی خاص خوشی ہے کہ پروفیسر گیان چند صاحب غالب کے ابتدائی اردو کلام پر روشنی ڈالیں گے جس نے مجھے ذاتی طور پر بہت متاثر کیا ہے، اگرچہ غالب کے اس سوال کا جواب اُن کے مطبوعہ دیوان ہی میں ملتا ہے:

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم میں لگایا ہے مجھے

اس مطبوعہ دیوان میں بہت سے اشعار ہیں جن میں اس وقت کے عام مذاق اور بہادر شاہ ظفر کی بوڑھی رومانیت کا اثر نظر آتا ہے اور بہت سے ایسے اشعار بھی ہیں جن میں تخیل کے پیچ ہیں مگر گہرائی نہیں۔ لیکن غالب کی پوری عظمت بھی اسی دیوان میں نظر آتی ہے اس وجہ سے کہ اس میں وہ عقلیت جو پہلے غالب کو فلک پیمائی پر آمادہ رکھتی تھی زمین پر اتر آئی ہے اور ہمارے شوق، ہماری واردات قلبی، ہماری پوری زندگی کا ایسا آئینہ بن گئی ہے جس میں ہم اپنے آپ کو دیکھتے ہیں، اپنے اوپر حیرت اور افسوس مگر اپنی انسانیت پر ناز بھی کرتے ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور

سرسید کے اسلام کے تصور کی اہمیت آج کیا ہے

میں اکثر اپنے سے یہ سوال کرتا رہا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے، کیوں آج کے بیشتر مفکروں کے یہاں مذہب سے بیگانگی بلکہ بیزاری کا میلان زیادہ نمایاں ہے، کیوں مادّی وسائل میں ترقی، علم و دانش کے عروج، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ مذہب کے ہمہ گیر اثرات اور ان کی انسان کی پوری زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ اب بھی کروڑوں انسان کسی نہ کسی مذہب کو مانتے ہیں اور لاکھوں اپنی زندگی کو اپنی بصیرت کے مطابق اس کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں یا ڈھالنا چاہتے ہیں، یا دانش ور اور مفکر ایک مذہبی بنیاد یا ایک روحانی پیاس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں یا کچھ مورخ ٹوائن بی کی طرح انسانیت کی تاریخ کا خاکہ مرتب کرتے وقت ایک مذہبی رنگ کو خاص اہمیت دیتے ہیں، یا کچھ سائنس داں اور ادیب سائنس اور روحانیت کا ملاپ کرانا چاہتے ہیں۔ میں ایمانداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ ذہن و فکر گو سائنسی ترقی اور مادی خوش حالی کے جدید ترین نمونوں سے خوش نہیں ہے، پھر بھی مذہب کی ضرورت اور اہمیت کا وہ عام احساس آج نہیں پایا جاتا جو آج سے سو سال پیشتر تھا اور نہ اب مذہب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آج کے ذہن کے سارے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے۔ میں نے انسانی تہذیب کے ارتقا، قوموں کی تاریخ اور افکار و اقدار کی تاریخ کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، اور مجھے یہ اعتراف ہے کہ یہ مطالعہ بہت گہرا

نہیں ہے، اس نے مجھے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے جو ترقی کی ہے
اس میں مذہب کو بہت کم دخل رہا ہے بلکہ عام طور پر مذہب یا رواجی مذہب یا کلیسا یا علما۔ یا
برہمن اس ترقی کے مخالف رہے ہیں اور یہ ترقی ان کی مخالفت کے باوجود ہوئی ہے۔ اس وجہ سے
مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ ہر دین جب شریعت بنا تو جہاں اس نے قدرتی طور پر زندگی کے لیے
ایک نظام اوقات بنایا وہاں اس نے ایک طرف اپنے آپ کو محصور کر لیا یا سکیڑ لیا اور دوسری
طرف یہ شریعت یا قانون ایک خاص طبقے کی سپر بن گیا جس نے اپنا اقتدار قایم رکھنے کے لیے ان
قوانین کی روح کو نظر انداز کر دیا اور ان کی ان منجمد تعبیرات پر اصرار کیا جو وقت کے بدل جانے
کے ساتھ اپنی حیات بخش اور حیات آفریں صلاحیتیں کھو بیٹھی تھیں اور اس لیے انسان
کی مادی ترقی، تسخیرِ فطرت، تسخیرِ کائنات، مشینی نظام کی سہولتوں اور سماجی فلاح کے منصوبوں
میں حارج ہوتی تھیں۔ اس لیے میرے نزدیک موجودہ دور کے امراض کا علاج مذہب کے اس
پرانے نسخے سے نہیں ہو سکتا جس کا نام شریعت ہے کیونکہ موجودہ دور کی برکتیں اور لعنتیں
مذہب سے قرب یا بیگانگی کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ قانونِ قدرت کے مطابق موجودہ فکر کی
پیداوار ہیں۔ ہر تحریک اپنے ساتھ کچھ برکتیں اور زحمتیں لاتی ہے، بلکہ ہر برکت کچھ عرصے کے بعد
اپنی حد سے بڑھ کر ایک زحمت ہو جاتی ہے۔ اس طرح کچھ برکتوں کے ساتھ ایک دوسرے قسم کی
زحمتیں چپکی ہوتی ہیں۔ مشین ہزاروں آدمیوں کے مہینوں کے کام کو منٹوں میں کر دیتی ہے۔
اس کی وجہ سے فرصت (Leisure) کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور فرصت تفریح چاہتی
ہے، دماغ سوزی نہیں چاہتی۔ یہ تفریح چونکہ ذہن کو بیدار نہیں کرتی بلکہ سلاتی ہے اس لیے
ایک قسم کی افیون بن جاتی ہے جو بالآخر اعصاب کو بے معنی ہیجانات کا عادی بنا دیتی ہے۔ اس کا علاج
فرصت کو کم کرنے یا تفریح کو ختم کرنے میں نہیں بلکہ ایسی بے معنویت کی حامل تفریحات کو عام کرنے
میں ہے جو اقدار کے احساس کو باقی رکھیں اور اعصاب کو امراض کی طرف نہ لے جائیں۔
مذہب کے تین بڑے پہلو کہے جا سکتے ہیں۔ ایک عقاید، دوسرا عبادات، تیسرا معاملات۔

ظاہر ہے کہ عقائد کے سلسلے میں بنیادی عقیدہ توحید اور رسالت کا ہے۔ ایمان کے لیے اقرار باللسان کے ساتھ تصدیق بالقلب کی بھی شرط ہے، لیکن چونکہ دل کا حال ہم نہیں جانتے اس لیے سوائے اس کے کہ ہم اقرار باللسان کو مان لیں، ہمارے لیے کوئی چارۂ کار نہیں ہے یعنی جو اپنے کو مسلمان کہتا ہے وہ مسلمان ہے اور ہمیں اس کے اس قول پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔
رہا عبادات کا معاملہ تو یہ عبادات دو قسم کی ہیں۔ ایک انفرادی عبادتیں اور ایک اجتماعی عبادتیں۔ جس طرح عقیدے کے معاملے میں صدیوں سے مسلمانوں نے نکتہ کے سہارے ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے فرقوں کا آغاز ہوا ہے، اسی طرح عبادات کے معاملے میں افراط و تفریط ہوئی ہے اور امام کی داڑھی پر اصرار یا لاؤڈ اسپیکر کے بغیر نماز پر اصرار یا آمین بالجہر کی مخالفت یا موافقت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح عقیدے کے معاملے میں بنیادی شرط کو کافی نہیں سمجھا گیا، اسی طرح عبادات کے سلسلے میں دین کی روح کے بجائے مفتی کے فتوے کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ رویت ہلال کا مسئلہ اس کا مزید ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عقیدے کے معاملے میں اگرچہ دنیوی زندگی کی سہولتوں پر اوّل اوّل نظر تھی مگر بعد کے شارحین نے ایک فارغ البال طبقے کے لیے عقاید اور عبادات کے ایسے قوانین بنائے کہ دنیوی زندگی کی مصروفیات میں خلل پڑنے لگا۔ بچپن میں میں نے پڑھا تھا کہ حضرت معاذؓ بن جبل صبح کی نماز میں بڑی لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے۔ ایک صحابیؓ جنھیں اپنے کام پہ جانا تھا، نیت توڑ کر اور صف کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اُن سے پوچھا گیا اور بالآخر معاملہ رسول اللہؐ تک پہنچا۔ آپ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو طویل سورتیں پڑھنے سے منع کیا۔ میرے نزدیک اسلام کی حیات بخش اور حیات آفریں طاقت کو ان مبصرین اور شارحین نے بہت نقصان پہنچایا کیونکہ ان کی نظر مذہب کے تیسرے پہلو یعنی معاملات پر اتنی گہری نہ تھی۔
معاملات کا تعلق صرف ایک مسلمان کے دوسرے مسلمانوں سے رشتے تک نہیں ہے

بلکہ اس میں غیر مسلموں سے رشتہ بھی آجاتا ہے۔ معاملات کے سلسلے میں اسلام کے اصول عدل اور مساوات پر مبنی ہیں مگر عملی زندگی میں پہلے بادشاہت نے، پھر فتوحات نے، پھر رسم ورواج نے اس حسنِ سلوک پر ایسی گرد چڑھادی کہ معاملات کے دور رس اثرات کو نظرانداز کر کے، صرف عقاید اور عبادات کی صحت اور ایک خاص معیار کے مطابق صحت پر زور دیا گیا۔ معاملات میں، معاشرت معیشت کا پورا نظام، سیاسی اور سماجی زندگی کے سبھی عنوان آجاتے ہیں سماجی تبدیلیوں کے ساتھ معاملات کے اس تصور میں تبدیلی ضروری تھی مگر مجموعی طور پر اس تبدیلی کی مخالفت کی گئی اور جن لوگوں نے اس تبدیلی پر زور دیا انھیں کافر زندیق کہا گیا۔ یہاں اس حقیقت پر زور دینا مقصود ہے کہ سامنتی یا جاگیردارانہ نظام کے تقاضے اور تھے اور صنعتی نظام کے اور بعد سوشلسٹ نظام کے اور ہیں لیکن تاریخ عالم کا یہ ایک عجوبہ ہے کہ جس طرح مغرب میں کلیسا نے عام طور پر برسرِ اقتدار طبقے کا ساتھ دیا، اسی طرح اسلام کی تاریخ میں بھی چند نفوسِ قدسیہ اور آزاد راویوں کو چھوڑ کر عام طور پر ایسے علمار برسرِ اقتدار طبقے کو جلد میسّر آگئے جو بجائے بنیادی مسائل پر غور کرنے کے اور سماجی تبدیلیوں کا ساتھ دینے کے عام مسلمانوں پر اپنا اثر قایم رکھنے کے لیے فقہ کے خاص اصولوں کی پابندی پر زور دیتے رہے، یا اپنے محدود دائرے میں اپنی قیادت کو کافی سمجھتے رہے اور دنیوی معاملات میں قیادت کو بادشاہوں یا فاتحوں یا فوجیوں پر چھوڑ کر مطمئن ہوگئے۔ دین کی سلامتی کے لیے اس کے دنیوی پہلو پر جو توجہ ضروری تھی وہ نہ ہوسکی مثلاً جمہوریت کا موجودہ تصور اسلام میں نہیں ہے مگر جمہوریت کی روح موجود ہے۔ جب انقلاب فرانس کے بعد مساوات، اخوت، حرّیت کا نعرہ بلند ہوا اور اس سے پوری دنیا متاثر ہوئی تو اس کی گونج اوّل تو اسلامی دنیا تک دیر میں پہنچی، دوسرے قدیم نظام تعلیم نے چونکہ ذہن کو فروعات میں الجھے رہنے کا عادی بنادیا تھا اور علوم دینیہ کی تحصیل ایک ایسا طبقہ کرتا تھا جو دنیوی علوم کے بڑھتے ہوئے سرمایے سے کماحقہٗ واقف نہ تھا، اس لیے جس طرح برہمن اپنی ذات کے اقتدار کو باقی رکھنے کے لیے سنسکرت کی تعلیم کو عام نہیں کرنا چاہتا تھا، اسی طرح علمار بھی علومِ دینیہ کی تعلیم صرف ایک خاص طبقے کے

اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے چاہتے تھے اس کا عام ہونا اور دنیوی علوم سے مربوط ہونا انھیں گوارا نہ تھا۔ اپنے استاد کے نام اورنگ زیب کا خط اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے رسالے "الانصاف فی بیانِ سبب الاختلاف" میں ایسے علماء و فضلاء کے متعلق ایک دلچسپ بات کہی ہے:

"خلفائے راشدین کا مبارک دور جب ختم ہوگیا تو زمامِ خلافت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو نہ اس امانت کو اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور نہ ان میں فتاویٰ اور احکامِ شریعت سے کچھ لگاؤ تھا اس لیے وہ مقدمات فیصل کرنے کے لیے اور قضائے شرعی جاری کرنے کے لیے مجبور ہوئے کہ فقہا سے مدد لیں اور ہر وقت انھیں اپنے ساتھ رکھیں۔۔ جاہ پسند لوگوں نے جب دیکھا کہ ان فقہا کی بڑی عزت ہے اور وہ اپنے اعراض اور استغنا کے باوجود اربابِ حکومت کے مطلوب خاطر بنے ہوئے ہیں تو ان کے دلوں میں اس علم دین کے حاصل کرنے کا انتہائی شوق پیدا ہوگیا تاکہ اسے بازار میں لاکر عزت و شرف کا سودا کریں۔۔۔ قیل و قال اور اعتراض و جواب کا بازار گرم ہوچکا تھا اور بحث و مناظرے کی راہیں ہموار ہوچکی تھیں۔ ان فقہاء کے لیے یہ چیزیں خاص توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن گئیں اور ایک مدت تک بنی رہیں۔ یہاں تک کہ ایسے خلفاء اور سلاطین پیدا ہوئے جو فقہی مناظروں کے بڑے دلدادہ تھے، جنھیں اس وضاحت کے سننے کا بڑا شوق تھا کہ فلاں مسئلے میں اولیٰ مسلک مسلکِ حنفی ہے یا مسلکِ شافعی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اربابِ فن کلام اور دیگر علوم کے میدانِ تحقیق و جستجو سے نکل کر اختلافی مسائلِ فقہ کے معرکے میں اتر آئے۔۔۔ ستم یہ کہ ان کا خیال تھا کہ وہ اس طرح شریعت کے اسرار و دقایق کا استنباط کر رہے ہیں۔۔۔ اس خیال کے ماتحت انھوں نے تصنیفات اور استنباطات کا ڈھیر لگادیا اور بحث و جدال کے گوناگوں

اسلحے ایجاد کر ڈالے۔ افسوس کہ وہ اب تک اسی روش پہ چلے جا رہے ہیں۔ نہیں معلوم اب مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔"

—— اقتباس از علی گڑھ تحریک/ ۱۰۵، ۱۰۶

میں دراصل اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ یورپ نے ازمنہ وسطیٰ کی جن ذہنی پابندیوں اور فکر پر احتساب سے نشاۃ ثانیہ کے دور میں آزادی حاصل کر لی۔ اسلامی دنیا نے یہ کوشش شاہ ولی اللہ، سرسید اور جمال الدین افغانی کے ذریعہ اپنے اپنے دایرے میں کی مگر دراصل مجموعی طور پر یہ احتساب اور پابندی ابھی تک موجود ہے۔ میرے نزدیک یورپ میں دورِ جدید، صنعتی انقلاب، انقلابِ فرانس، انیسویں صدی کی سائنس، مارکسی تعلیم، روسی انقلاب اور بیسویں صدی کی ساری ذہنی وفکری ترقی اس ذہنی آزادی کی مرہونِ منت ہے جس نے ایک طرف حریتِ فکر پر پابندی کو ختم کیا، دوسری طرف سماجی اور سیاسی زندگی میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی فلاح کو قدر بنایا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں میں ایسی تعلیم رائج کی کہ وہ خدمتِ خلق، محبت اور سماجی انصاف کو عام کرنے میں لگ جائیں۔ اسلامی دنیا میں مجموعی طور پر یہ نشاۃ ثانیہ کا دور کہیں پورے طور پر نہیں آیا۔ جہاں آیا وہاں چند ہی معاملات میں نشاۃ ثانیہ کے ثمرات ظہور میں آسکے۔ دوسرے اسلامی دنیا نے صنعت وحرفت کی طرف پوری توجہ نہ کی۔ نہ دنیوی علوم کے فروغ میں دل کھول کر حصہ لیا۔ اس نے انجینیری، ڈاکٹری، جرّاحی کے کاروبار میں غیر مسلموں کی اجارہ داری تسلیم کر لی۔ اپنے انجینیر، ڈاکٹر، جرّاح اور اہل حرفہ پیدا نہیں کیے۔ ان کے مقابلہ میں دربار اور فوج کو زیادہ اہمیت دی۔ زمیندار کو زمین دے کر وہ بے فکر ہوگئی۔ اس زمین کے مناسب استعمال اور پیداوار کے بڑھانے اور کانوں کے استعمال پر پوری توجہ نہیں کی۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ لوہے سے صرف ہل اور تلواریں بنائی گئیں اور سونے چاندی اور ہیرے نکال کر دولت جمع کی گئی مگر زیر زمین معدنیاتی خزانے پر اس کی نظر کم گئی۔ علماء سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اسلام کی روح کو اور اس کی حیات بخش اور حیات آفریں

قوت کو عام کرکے، عام اسلامی دنیا میں زندگی کی رَو دوڑا دیں گے مگر وہ عموماً اس جاگیردارانہ
نظام اور اس شہنشاہیت کی پشت پناہی میں لگے رہے جو رفتہ رفتہ بے وقت کی راگنی ہوتی
جا رہی تھی۔ میرے نزدیک ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، قدیم ہندوستان کے ذات
پات میں جکڑے ہوئے اور تنگ حصاروں میں پناہ گزیں لوگوں کے لیے ایک تازہ ہوا
کا جھونکا تھی، جو نظام مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے، اس میں نسبتاً علم کو عام کرنے اور
سماج کی بہتر تنظیم کی صلاحیت تھی مگر جب یہ صلاحیت جاتی رہی تو قدیم ہندوستان اور ازمنۂ وسطیٰ
کے ہندوستان دونوں کو مغرب کے زیادہ فعّال، زیادہ ہمہ گیر، زیادہ حیات آفریں، زیادہ سماجی
خیر اور دنیوی فلاح رکھنے والے نظریات نے جن کے پیچھے روشن خیالی کے دور
Age of Enlightenment کی روشنی کی کرن تھی، اس پس ماندہ، جامد، تنگ نظر،
اختلافات، رنجشوں، خود غرضیوں اور فروعات میں گھرے ہوئے نظام کو شکست دے دی۔
یہ بات کسی غلامانہ ذہن یا مغرب سے مرعوبیت کی بنا پر نہیں کہی جا رہی ہے، یہ اس وجہ سے
کہی جا رہی ہے کہ میرے نزدیک انسانی تہذیب ایک اکائی ہے۔ اس زمانے میں اس کی قیادت
ایشیا اور افریقہ نے کی۔ پھر یہ قیادت عربوں کے ذریعے سے یورپ کو ملی اور آج تک یورپ
اور امریکہ نے اس کارواں کی قیادت کی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ فکر کے دائرے میں بھی
مغربی حلقے کا کارنامہ کیفیت و کمیت کے لحاظ سے کسی سے کم نہیں ہے۔ علوم کے لحاظ سے اس
کا سرمایہ دوسری تمام تہذیبوں کے سرمایے پر فوقیت لے گیا ہے۔ فطرت کی تسخیر اور مادی وسائل
کی فراوانی کے لحاظ سے اس کا جواب نہیں ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں اس نے صدیوں کا
کام برسوں میں کیا ہے۔ اگر صرف اسلامی علوم کو لیا جائے تو یورپ اور امریکہ نے اسلام پر
جو تحقیق کی ہے وہ باوجود بعض فطری مجبوریوں کے، مجموعی طور پر اسلامی مورخوں اور محققوں
سے بن نہ سکی۔ میرے نزدیک ان سب ترقیوں کا راز حرّیتِ فکر میں ہے اور جب تک اسلامی
دنیا حریت فکر کو نہ اپنائے گی، دنیا اور دین دونوں کے دائرے میں کوئی قابل ذکر ترقی نہ کر سکے گی۔

اس لیے میں نے آج کی گفتگو کے لیے سرسید کے رول کا ذکر ضروری سمجھا۔ سرسید کی دوسری خدمات بڑی عظیم الشان ہیں مگر میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس عقلیت کو جو روشن خیالی کے دور نے مغرب کو عطا کی تھی اپنا رہبر بنایا، علم کی جستجو کی اور عقل اور علم دونوں کو فطرت یا Nature میں سمو دیا "فطرت علم کا سرچشمہ ہے اور عقل کی کسوٹی، فطرت سمجھ دار ہے اور فطرت مہربان۔ اگر آدمی فطرت کی بات پر کان دھرے تو وہ کبھی بہک نہیں سکتا۔ اسے تو فطرت کے ارشادات کی پابندی کرنا ہے۔"

سرسید کی تحریک نے رفتہ رفتہ اپنے اثرات دکھائے مگر سرسید کی عظیم الشان ذہنی بیداری کی مہم کا بنیادی کام مسلمانوں کی ذہنی تربیت تھی جس کے لیے رواجی مذہب پر آنکھیں کاری ضرب لگانی پڑی لیکن وہ ایم۔ اے۔ او کالج کے قصر بلند کی زینت بن کر رہ گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن پر بیسویں صدی میں سب سے گہرے اثرات امیر علی، ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری اور اقبال کے پڑے ہیں۔ چاروں نے سرسید سے فیض حاصل کیا، چاروں کو سرسید کی تحریک کی روشنی ہی میں سمجھا جا سکتا ہے مگر چاروں کا علی گڑھ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ایم۔ اے۔ او کالج جس کی ہمارے رشید صاحب تعریف کرتے نہیں تھکتے، مسلمانوں کی ذہنی قیادت اس لیے نہ کر سکا کہ سرسید نے اس کی خاطر پہلے تو تہذیب الاخلاق میں اختلافی مسائل پر مضامین بند کرنے کا وعدہ کیا اور پھر کالج کی مذہبی تعلیم اس طبقے کے حوالے کر دی جس کی مخالفت وہ زور شور سے اپنی تحریروں میں کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ مغربی علوم کی تعلیم اور انگریزی کے ذریعے سے تعلیم کے اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے مگر سرسید کا بنیادی کام پورا نہ ہو سکا۔ یہ بنیادی کام ہندوستانی مسلمانوں کو ازمنہ وسطیٰ کے ذہن سے نکال کر روشن خیالی کے دور میں لانے کا تھا۔ سرسید نے کالج کا جو ابتدائی خاکہ بنایا تھا اس میں بھی یہ گنجائش تھی کہ حالات حاضرہ سے باخبر علما پیدا کیے جا سکیں مگر اس خاکے کے صرف پہلے حصہ پر عمل ہو سکا دوسرے اور تیسرے حصے پر عمل کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ خاکہ یہ تھا:

"پہلا مدرسہ انگریزی کا ہوگا۔ اس میں بالکل انگریزی پڑھائی جائے گی اور تمام علوم وفنون جو کچھ اس میں تعلیم ہوگا سب انگریزی میں ہوگا۔ اس مدرسہ کے لیے دو مقصد سید صاحب کے پیش نظر تھے۔ ایک یہ کہ "جو لوگ سرکاری عہدوں اور عزتوں کے خواہاں ہیں وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ دوسرے مسلمانوں میں بھی ایک جماعت اس قسم کی ہو کہ وہ نہایت اعلیٰ درجے کا کمال انگریزی میں حاصل کرلے کیونکہ اس جماعت سے ملک اور ملک کے لوگوں کو اور ترقی تعلیم کو بہت فائدہ ہوگا اور وہ ذریعہ اور منبع شیوع علم کے بن جاویں گے۔ ان کی بدولت تمام علوم انگریزی سے اردو میں آجاویں گے اور ان کی ذات سے ملک کو منفعت عظیم پہنچے گی۔"

دوسرا اُردو مدرسہ ۔۔ اس میں تمام علوم وفنون بہ زبانِ اردو پڑھائے جائیں گے۔

تیسرا عربی فارسی مدرسہ ۔۔ ان میں ان انگریزی اور اردو مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبہ کو جنھوں نے علوم وفنون پڑھ لینے کے بعد عربی یا فارسی لٹریچر وعلوم میں کمال حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہوگا تو ان کی پڑھائی۔ فارسی عربی میں اعلیٰ درجے تک اس مدرسہ میں ہوگی۔

ہمیں معلوم ہے کہ نہ اردو کا مدرسہ قائم ہوا نہ فارسی عربی کا اور انگریزی مدرسہ کا بھی صرف پہلا مقصد پورا ہوا۔ ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی کتاب "ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب" میں لکھا ہے:

"علی گڑھ اس طبقے کے لوگوں کی آرزوؤں اور حوصلوں کا آئینہ بن گیا۔ اس میں خوشحال خاندانوں کے لڑکے بقدر ضرورت جدید تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن زیادہ زور ایسے وضع ولباس، اخلاق وآداب، کھیلوں اور ورزشوں پر دیا جاتا تھا جن کے ذریعے سے انگریز حاکموں کی خوشنودی اور قربت حاصل ہوسکے ۔ ..... سید کی اصلاحی تحریک کے دوسرے پہلوؤں سے علی گڑھ کا مدرسہ قریب قریب بے تعلق رہا۔ ان کے مذہبی افکار تو دراصل مسلمانوں کے کسی طبقے میں مقبول ہی نہیں ہوئے لیکن اردو ادب پر اور مسلمانوں کی عام ذہنیت پر جو زبردست اثرات انھوں نے ڈالے

وہ نیاز، ہ تربراہ راست، بغیر علی گڑھ کے توسط کے، انفرادی طور پر، علی گڑھ کے بعض
طلبا، میں جنھیں سرسید سے ذاتی سابقہ رہا، ان کے علمی ذوق، ان کی آزادیِ فکر،
ان کے جوشِ اصلاح اور حکومت کے مقابلے میں ان کے وقار اور خودداری کا شائبہ
ضرور پیدا ہوگیا۔"

سرسید کے متعلق ان کے دور کے خاصے پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگوں کا عام تاثر اکبر کے ان اشعار سے واضح ہو جائے گا:

حاضر ہوا میں خدمتِ سید میں ایک رات　　　افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے کہ تجھ پہ دین کی اصلاح فرض ہے　　　میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

آیئے دیکھیں کہ اکبر نے جسے دین کی اصلاح کہا ہے اور جسے اُس زمانے میں نیچریت، بے دینی، الحاد اور کفر کا نام بھی دیا گیا تھا، دراصل کیا تھی:

خدا خالق، صانع تمام کائنات کا ہے۔ اس کا کلام اور جس کو اس نے رسالت پر مبعوث کیا ہرگز خلافِ حقیقت و خلافِ واقعہ نہیں ہو سکتا۔ کلام مجید کلام الٰہی ہے۔ قرآنِ مجید کی جو آیات ہمیں خلافِ حقیقت معلوم ہوتی ہیں یا تو ہم نے ان کا مطلب غلط سمجھا ہے یا حقیقت یا واقعہ کو غلط سمجھا ہے۔ دینیات میں سنتِ نبوی کی اطاعت میں ہم مجبور ہیں اور دنیوی امور میں مجاز۔ احکام منصوصہ احکام دین بالیقین ہیں اور باقی مسائل اجتہادی اور قیاسی سب ظنی ہیں۔"

عقل جس سے سرسید کی مُراد Rationalism نہیں بلکہ تجرباتی عقل یعنی Empirical Reason ہے، نیچر اور قوانین کو سمجھنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے:

"شخصی عقل اور انسانی عقل یا عقلِ کلی میں فرق ہے۔ ایک شخص کی عقل کی غلطی دوسرے شخص کی عقل سے اور ایک زمانے کی عقلوں کی غلطی دوسرے زمانوں کی عقلوں کی غلطی سے صحیح ہو جاتی ہے۔ اس تجرباتی عقل کے علاوہ کوئی اور رہنما نہیں ہوتا

چاہیے ۔ اجماعِ امت یا اجتہاد ائمہ واجب التعمیل نہیں ہے ۔ ہر تعلیم یافتہ اور صحیح العقل مسلمان اس بات کا حقدار ہے کہ ان مسائل میں جن کی بابت کوئی نص صریحی موجود نہیں ہے اپنی عقل اور بصیرت کے مطابق اسلام کی تعبیر کرے ۔"

"مذہب اسلام ان بندشوں کو توڑنے آیا تھا جو فطرت یا نیچر پر لوگوں نے باندھی تھیں اور کوئی نئی بندش نیچر یا خدا کے دین پر باندھنے نہیں آیا ۔ اس نے بیڑیوں کی بیڑیوں کو توڑا ہے اور کوئی نئی بیڑی یا ہتھکڑی نہیں ڈالی ہے ۔ اس نے پورا حق آزادی کا ، فطرت ، نیچر کے مطابق لوگوں کو دیا ہے اور اس کو ان کا دین بلکہ خدا کا دین بتایا ہے ۔ بس اوپر کی بندشوں کو توڑنے دو اور ٹھیٹ مذہب اسلام کو ، نیچر کو ، خدا کے دین کو ، خدا کے مذہب کو چمکنے دو ۔ جو چمکے گا اور کسی کے چھپائے نہیں چھپے گا ۔"

"مضامین سرسید" (شائع کردہ : شیخ محمد اسمٰعیل ، لاہور) حصہ پانزدہم ص۱۴۱

انھوں نے تہذیب الاخلاق کے پہلے پرچے میں ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا تھا ۔ تہذیب سے ان کی مراد انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت ، تمدن ، طریقۂ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا تھی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ان کے نزدیک ان چیزوں میں تہذیب کی ضرورت شدید تھی ۔

آزادیِ رائے ، درستیِ عقاید مذہبی ، خیالات و افعال مذہبی ، تدقیقِ بعض مسائلِ مذہبی ، تصحیح بعض مسائل مذہبی ، تعلیم اطفال ، سامانِ تعلیم ، عورتوں کی تعلیم نیز فن و حرفہ ۔ اس کے بعد اخلاقی ، معاشرتی اور معاشی زندگی کی بیس اور شقوں کا ذکر ہے جن کی اصلاح و ترقی تہذیب الاخلاق کے مقاصد میں داخل تھی ۔ ان کے عنوانات حسب ذیل

تھے :

خود غرضی، عزت اور غیرت، ضبط اوقات، اخلاق، صدق مقال، دوستوں سے راہ و رسم، کلام و لہجہ، طریقِ زندگی، صفائی، طرزِ لباس، طریقِ اکل و شرب، تدبیر منزل (انتظام خانہ داری)، فاقہ کی حالت میں، کثرتِ ازدواج، غلامی، رسوماتِ شادی، رسوماتِ غمی، ترقی زراعت، تجارت۔

میں نے یہ عنوانات اس لیے بیان کر دیے کہ اس سے سرسید کی نظر کی جامعیت کا اندازہ ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ عقاید، عبادات، معاملات تینوں پر ان کی نظر تھی اور وہ ایسے عقیدہ پر زور دینا چاہتے تھے جس کے ذریعے سے معاملات پر حالات حاضرہ کی روشنی میں پوری توجہ کی گنجائش نکل سکے اور محض فقہا و علما کے نظریات یا رسم و رواج کے بندھنوں کی وجہ سے پوری قوم کی ترقی میں خلل نہ پڑے۔ سرسید نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اس زمانے کے علما تک شریعت کے بعض احکامات کی تعلیم گول کر جاتے تھے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز اپنی بیوہ بہن کو تفسیرِ قرآن کا درس دیتے وقت نکاحِ بیوگان کے احکام حذف کر جاتے تھے۔ سرسید کا خیال یہ تھا کہ قرآن کی رو سے ایک جورو ہونی چاہیے اور ایک سے زیادہ کی اجازت بعض خاص صورتوں کے لیے ہے ورنہ خدا کو معلوم ہے کہ ایک سے زیادہ عورتوں میں عدل کرنا مرد کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ سود کو جائز سمجھتے تھے، جہاد کو صرف مذہب کے دفاع کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ وہ شخصی حکومت کے خلاف تھے اور محدود بادشاہت کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ایک پریذیڈنٹ جس کو لوگ پسند کریں اس کو اسلام پسند کرتا ہے۔ وہ دولت کے ایک جگہ اکٹھا ہونے کو غلط سمجھتے تھے وہ مذہب کے لحاظ سے اپنے آپ کو ریڈیکل سمجھتے تھے۔ انھوں نے صاف کہا کہ جس ملک میں مسلمان محکوم ہوں اور انھیں مذہبی آزادی حاصل ہو وہاں ان کو حکومت کے قوانین کی پابندی کرنی چاہیے۔

اگر سرسید کے مذہبی خیالات کالج میں پڑھائے جاتے، اگر ان کی تفسیر بھی دوسری تفسیروں کے ساتھ درس کا جز ہوتی، اگر ان کے ابتدائی خاکے کے مطابق انگریزی کے مدرسے کے علاوہ اردو کا مدرسہ اور عربی فارسی کا مدرسہ بھی ہوتا اور اگر انگریزی مدرسے کے صرف ایک جسد کی فکر نہ ہوتی بلکہ دوسرے پر بھی توجہ ہوتی، تو وہ ذہنی انقلاب عمل میں آسکتا تھا جو سرسید کا حقیقی مقصد تھا۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ قدامت پرست مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کے اوپری زوائد پر ہی توجہ کی اور صرف ملازمتوں کے حصول کا ہی ذریعہ سمجھا۔ اگر وہ مغربی علوم اور انگریزی ادب کے سارے بنیادی افکار و اقدار کا خیر مقدم کرتے تو یقیناً یہ آتش نمرود اسی طرح ان کے لیے گلزار بن جاتی جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے لیے بن گئی تھی۔

بات یہ ہے کہ سائنس اور علوم جدیدہ یا مشین اور صنعتی کمالات سے واقف ہونا کافی نہیں ہے۔ ان کی روح تک پہنچنا ضروری ہے۔ ہندوستان میں عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں میں خصوصاً ایک دوشاخا پن (Dichotomy) ہے۔ یہ معلومات، وسائل، ہنر حاصل کرنے پر اس لیے تیار ہیں کہ اس کے بغیر چارہ نہیں، مگر ان کے پیچھے جو ذہن ہے اسے قبول کرنے کو تیار نہیں۔

سرسید کو کالج کی خاطر اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت ترک کرنا پڑی۔ کالج کے قیام کے سلسلے میں انھیں انگریز پرنسپلوں کو اپنی سیاست کو بھی قبول کرنا پڑا۔ اس وقت کی یہ مجبوریاں سمجھ میں آتی ہیں مگر یہ حیرت کی بات ہے کہ آج بھی ہندوستانی مسلمان مذہب کے سلسلے میں سرسید کا پوری طرح ہم نوا نہیں ہے۔ آج بھی اجتہاد، جس کی ضرورت پر سرسید نے اتنا زور دیا تھا اور جس کو اقبالؔ نے بھی اپنے فکر میں ایک مرکزی حیثیت دی ہے، ہندوستانی مسلمان کو ایک خطرہ نظر آتا ہے۔ مغرب جو صلیبی جنگوں کے اثرات کی وجہ سے اسلام کے ساتھ انصاف نہ کر سکا تھا۔ آج مستشرقوں کے اثر سے اسلام کے آفاقی پیام کی اہمیت کو محسوس کرنے لگا ہے۔ شافت، منگمری، واٹ، برنارڈ لیوس اور کنیٹ ویل اسمتھ کے خیالات اس

سلسلے میں قابلِ غور ہیں۔

ہندو ذہن عقائد میں شروع سے خاصا لچک دار ہے۔ اس لیے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہندوستانی مسلمان کیوں خوفزدہ اور اپنے حصار میں بند ہے۔ نئے افکار سے خطرہ تمام مذاہب کو ہے صرف اسلام کو ہی نہیں۔ اسلام اپنے چند سادہ عقاید اور ایک عملی تعلیم کی وجہ سے ان نئے افکار کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے ہندوستانی اسلام جدید دور میں اپنا خاصا اہم رول ادا کرسکتا ہے اور معاملات میں چند اخلاقی اور سماجی قدروں کو اپنا کر محنت اور خدمتِ خلق پر زور دے کر اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کرسکتا ہے مگر وہ اوّل تو علماء کی قیادت کے زیرِ اثر اور دوسرے ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن سے چپکے ہوئے ہونے کی وجہ سے اور تیسرے جاگیردارانہ مزاج پر اصرار کرنے کی وجہ سے، ہر اس اصلاحی کوشش کی مخالفت کرتا ہے جو خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے، بلکہ وقت اور حالات کا تقاضا ہے، اس سلسلے میں چند مثالیں دینا چاہتا ہوں :

۱۔ عرب اور اسرائیل کی کشمکش میں اسرائیل کی فتح صرف امریکہ کی مدد کا نتیجہ نہیں، بلکہ در اصل جدید ذہن اور ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن کی لڑائی ہے اور عربوں کی شکست مجموعی طور پر ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن کی شکست ہے۔

۲۔ ہندوستان میں سوشل رفارم کا جو سلسلہ رام موہن رائے سے شروع ہوا اس کا قدرتی نتیجہ ہندو کوڈ بل تھا۔ ہندوؤں نے جو اس معاملے میں مسلمانوں سے بہت پیچھے تھے اتنی انقلابی تبدیلی کو قبول کر لیا مگر تعددِ ازدواج کے متعلق علماء کے اثر سے ہندوستانی مسلمان اب تک ہر اس تحریک کی مخالفت کرتا ہے جو تعددِ ازدواج پر تھوڑی سی پابندی بھی لگانا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ذاتی گفتگو کا حوالہ دینا شاید بے جا نہ ہو۔ جس زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم زندہ تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اگزکٹیو کونسل کے جلسوں میں شرکت کے لیے یہاں آتے تھے، تو اکثر مختلف مسائل پر ان سے تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔

ب اخباروں میں یہ اطلاع آئی کہ پاکستان نے تعددِ ازدواج پر پابندی لگائی ہے اور اب دوسری شادی کرنے کے لیے ایک ٹریبونل کی اجازت ضروری ہے جس میں ایک ماہر قانون اور ایک عالم ہوگا، تو میں نے مولانا سے کہا کہ ہندوستان میں آپ کب اس قسم کا قانون لائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان کے اس قانون سے میں متفق ہوں مگر ہندوستان کی سیکولر حکومت کو ایسا قانون بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں نے بعض دوسرے اسلامی ممالک کا حوالہ دیا جہاں اس سے زیادہ ریڈیکل قوانین بنائے گئے ہیں مگر مولانا نے میری بات سننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مسلم حکومتوں کو یہ حق ہے مگر غیر مسلم حکومتوں کو نہیں۔ میرے نزدیک اگر ایک سیکولر حکومت مسلمان دانش وروں، مسلمان قانون دانوں، وکیلوں، علمار اور سنجیدہ اور ذمہ دار اشخاص کے مشورے سے ایسا قانون بنائے تو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ قانون کے سلسلے میں ایک نکتہ اور اہمیت رکھتا ہے۔ آج بھی ہندوستان کے بہت سے مسلمان شرعِ محمدی کے بجائے رواجی قانون پر چلتے ہیں۔ تعلقہ داروں اور زمینداروں میں یہ میلان عام رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ رواجی قانون شرعِ محمدی کے خلاف پڑتا ہے اور دولت کو چند ہاتھوں میں مخصوص رکھنا چاہتا ہے۔ بڑے لڑکے کو زیادہ حق دیتا ہے اور لڑکیوں کو عام طور پر ان کے جائز حق سے محروم رکھتا ہے۔ ہماری عدالتیں اس رواجی قانون پر چلنے کی اجازت دیتی ہیں اور علمار اس سلسلے میں کوئی احتجاج نہیں کرتے۔ اسی طرح تعددِ ازدواج کے سلسلے میں یا طلاق کے سلسلے میں بھی، عام مسلمان کو اگر اس کی اجازت ہو کہ وہ یا تو شرعِ محمدی کی پابندی کرے، یا ملک کے قانون کی، تو ایسی صورت میں بیچ کی ایک راہ پیدا ہو سکتی ہے۔

اسی طرح خاندانی منصوبہ بندی کا مسئلہ ہے۔ ماہرینِ اقتصادیات اب اس بات پر متفق ہیں کہ اگر آبادی کی بڑھتی ہوئی تعداد کو نہ روکا گیا تو کچھ عرصے بعد غذا کا وہ سرمایہ جو زمین سے حاصل ہو سکتا ہے ناکافی ہو جائے گا۔ دوسرے صاف ستھرے گھروں اور کھلی فضا میں

رہنے کا تصور خواب بن جائے گا۔ اب بھی بڑے شہروں کی گنجان آبادی میں کتنے لوگ ایسے ملیں گے جنھوں نے آسمان نہیں دیکھا، دریا اور سمندر سے ناواقف ہیں، پڑھا لکھا طبقہ عام طور پر اس بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرہ سمجھتا ہے، لیکن نچلے طبقے میں چونکہ ایک تو مالی پریشانیاں زیادہ ہوتی ہیں اور زندگی کی سختیوں کا زیادہ مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور تعلیم کی کمی اور سنجیدہ تہذیبی مشاغل سے محرومی ہوتی ہے، اس لیے تفریح ۔ ۔ جنسی عمل میں ممکن ہے جس کا نتیجہ بچوں کی کثرت ہے۔ بقولِ اکبر:

عاشقی قیدِ شریعت میں جو آجاتی ہے جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

علمار سے توقع یہ تھی کہ وہ وراثت، طلاق، تعددِ ازدواج، خاندانی منصوبہ بندی کے متعلق قرآن کی روح سے استفادہ کر کے، جدید حالات اور جدید مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں گے مگر اس معاملے میں علمار کوئی اقدام کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نوجوان طبقے میں جو ان مسائل سے دوچار ہے مذہبی احکام کی طرف سے غفلت، رفتہ رفتہ مذہب سے بے نیازی کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے اور محض خالی خولی اسلام کا نام لے کر اپنی زندگی کو بالکل غیر مذہبی بنانے کا میلان ترقی کرتا جا رہا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ رویتِ ہلال کے متعلق ہر سال الجھنیں پیدا ہوتی ہیں مگر ان کا کوئی حل نہیں نکالا جاتا۔ پاکستان میں جب جنرل ایوب خاں نے اس سلسلے میں اقدامات کیے تو علمار نے ان کی سختی سے مخالفت کی اور عام مسلمانوں کی بڑی تعداد نے ان کا ساتھ دیا۔

چند روشن خیال علمار کو چھوڑ کر مجموعی طور پر ہندوستان کے علمار تقلیدی رہے ہیں۔ انھوں نے اجتہاد کے مسئلے پر کماحقہ غور نہیں کیا۔ شبلی جب علی گڑھ ایم۔ اے۔ او کالج سے مایوس ہوئے تو انھوں نے ندوۃ العلمار میں حریت پسند اور حالاتِ زمانہ سے باخبر علمار پیدا کرنے کی سعی کی مگر جیسا کہ شرر نے لکھا ہے، علمار سے شبلی بری طرح پٹے اور ان کا یہ خواب کہ وہ روشن خیال علمار پیدا کریں گے، پارہ پارہ ہو گیا، ہاں اِدھر اُدھر اپنے بعض نقوش

چھوڑ گیا۔ دیوبند کے علمار نے چونکہ مذہبی نقطۂ نظر سے انگریزوں کی غلامی پر احتجاج کیا اور سرسید نے مجموعی طور پر انگریزوں سے تعاون پر زور دیا اس لیے بہت سے لوگ دیوبند کے علمار کو ترقی پسند اور سرسید کو آزادیِ ہند کا مخالف سمجھتے ہیں، حالانکہ دیوبند کے علمار کا یہ سیاسی رول، سیاست کے شعور پر مبنی نہیں تھا، ایک خاص مذہبی فکر کا نتیجہ تھا جس میں انگریز اور اس کی ہر چیز سے تعاون مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا، اس لیے میرے نزدیک ہندوستانی سیاست میں جمعیۃ العلمار کی قوم پرستی اور ہندوستان کی سیاست سے ہم آہنگی گو قابلِ تعریف ہے مگر اس لیے اہم اور معنی خیز نہیں ہے کہ موجودہ سیاست کے پیچ وخم کو سمجھے بغیر اور موجودہ ذہن، اس ذہن کے طریقۂ فکر اور اس کی زبان کو استعمال کیے بغیر اور سائنس اور ٹکنالوجی نے جو عالمی مسائل پیدا کیے ہیں۔ ان سے پوری طرح آشنا ہوئے بغیر، سیاسی رول معنی خیز اور دوررس نہیں ہوسکتا۔ میرے نزدیک تہذیبی تصور میں انقلاب کے بغیر ریاست میں بھی کوئی انقلاب نہیں لایا جاسکتا۔ سرسید کے تہذیبی تصور میں اس دنیوی پہلو کا پورا احساس موجود ہے جو دین میں بھی اہمیت رکھتا ہے یعنی معاملات اور اس تہذیبی تصور سے، زندگی کے تمام شعبوں یہاں تک کہ سیاست میں بھی انقلابی تبدیلیاں ممکن ہیں۔ اس لیے سرسید کے بنیادی تصورات اور ان کے عملی پروگرام میں جو وقتی ضروریات کے مطابق تھا فرق کرنا پڑے گا۔ یہ بنیادی تصورات آج بھی ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، البتہ ان کے وقتی پروگرام کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنانا پڑے گا۔

سمجھا جاسکتا۔ سرسید روشن خیالی کے دور کے تصورات اور انیسویں صدی کی سائنس سے بہت مرعوب تھے اور ان کی یہ ذہنی مرعوبیت ہمارے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہے یہاں میرے نزدیک ایک منطقی غلطی ہے۔ عالمی سرمایۂ افکار پر ہمارا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اور کا اور ہمارا اپنا سرمایۂ افکار بھی صرف ہمارا نہیں ہے۔ دراصل افکار وعلوم میں اس قسم کی دیواریں اس ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن کی نشاندہی کرتی ہیں جو پھیلاؤ کے بجائے

سکڑنے پر. نشرو اشاعت کے بجائے حفاظت پر، جذب وانجذاب کے بجائے ہر بیرونی اثر
کو کاٹ کر پھینک دینے پر زور دیتا ہے۔ میرے نزدیک ہندوستانی مسلمانوں کی موجود
ذہنی کیفیت کی ذمہ داری بڑی حد تک اس سمٹے ہوئے ذہن، اس نقاب اور حجاب کی
عادی طبیعت اور اس علیحدگی پسندی پر ہے جو ہر میل میں مصیبت دیکھتی ہے، ہر نئی تحریک
کو ایک نیا خطرہ سمجھتی ہے اور جسے آج کی زندگی بلاؤں کا ایک ہجوم نظر آتی ہے جو ہمارے
مسلمانوں کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

میرے نزدیک سرسید کے بنیادی افکار کی روشنی میں ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری
اور اقبال کی اجتہاد سے دلچسپی کی معنویت واضح ہوگی۔ اقبال صرف شاعر نہ تھے۔ انھوں
نے تقدیرِ اُمم اور عالمِ اسلام کے مسائل پر جس طرح غور کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ
جدید دور کے امکانات سے واقف تھے اور وہ روایت کا اس طرح استعمال کرنا چاہتے تھے
کہ وہ اجتہاد کے لیے دروازہ کھول سکے۔ سرسید کی تفسیر اور اقبال کے الہیات کی تشکیل جدید
من ویزداں اور ابوالکلام آزاد کی سورہ فاتحہ کی تفسیر کو درسیات کی بنیاد بنانا چاہیے۔ اس
کے علاوہ سرسید کے اس مکان کو جواب کھنڈر ہے اور جو زبانِ حال سے ہماری توجہ کا شاکی ہے،
جلد سے جلد دوبارہ تعمیر کر کے اس میں ایک ایسا علمی تحقیقی ادارہ قایم کرنا چاہیے جو سرسید
کے مجوزہ تیسرے مدرسے کی ضروریات پوری کر سکے۔ اس میں صرف وہ لوگ لیے جائیں جو
ایک طرف اسلام اور دیگر مذاہب سے گہری واقفیت رکھتے ہیں اور دوسری طرف جدید علوم
میں کم سے کم ایم اے کی ڈگری رکھتے ہیں۔ اس ادارے کو تہذیب الاخلاق بھی دوبارہ
جاری کرنا چاہیے اور مستشرقین کی تحقیقات کی مدد سے اور مشرقی اور مغربی علوم کے سہارے
ان تمام مسائل پر تحقیق و تدقیق کرنا چاہیے جو ہندوستان میں اسلام کے حیات بخش اور حیات
آفریں رول کے لیے ضروری ہیں۔ آج مسلمانوں کی ذہنی قیادت نہ صرف علما کر سکتے ہیں نہ
سیاسی پارٹیوں سے وابستہ اور طاقت کے جویا لیڈر، نہ حکومت سے وابستہ حضرات، نہ محض

مخالفت کو شعار بنانے والے حضرات۔ اس ذہنی قیادت کے لیے جمہوریت پر اعتماد ضروری ہوگا، موجودہ مسائل کا ہمدردی سے مطالعہ کرنا ہوگا۔ تشکیک کو بھی ایمان کی ایک منزل سمجھنا پڑے گا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے پیدا کردہ مسائل سے خوفزدہ ہونے کے بجائے ان میں اپنا راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔ حریت فکر کو اپنانا پڑے گا اور مذہبی مسائل میں سنجیدہ اور پرخلوص اختلافات کی گنجائش رکھنا ہوگی، یہاں تک کہ جو لوگ مذہب کی اہمیت سے سرے سے انکار کرتے ہیں، ان کو بھی مولانا حسرت کی طرح ایک مذہب کا پیرو ماننا پڑے گا۔

کنیٹ ویل اسمتھ نے آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کے رول کی طرف اپنی کتاب Islam in Modern History میں جو اشارہ کیا ہے وہ نہایت معنی خیز ہے۔ اسلام ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت نہ ہوتے ہوئے، ہندوستان میں ایک اہم اخلاقی اور سماجی رول ادا کر سکتا ہے تو اس سے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ ساری دنیا کو فائدہ پہنچے گا۔ دیکھنا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس فریضے کی طرف کب متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے لیے صرف اسلام کی فعال اور آفاقی تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنا ہی نہیں ہوگا بلکہ مسلمانوں کو سماجی خیر اور رفاہِ عام کے ایسے کام بھی شروع کرنے ہوں گے جو صرف مسلمانوں کے لیے نہ ہوں۔ عیسائیوں اور پارسیوں کے خیراتی اسپتال اور اعلیٰ تعلیم کے ہندوؤں، عیسائیوں کے اداروں کے نمونے پر مسلمانوں کو بھی بہت سے ایسے ادارے کھولنے پڑیں گے جو سب کے لیے ہوں۔ ہندوستان میں اسلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہندوستانیوں کے سارے مسائل سے گہرا تعلق رکھے اور سبھی ہندوستانیوں کے دکھ سکھ میں حصہ لے۔ وہ صرف حقوق کا مطالبہ نہ کرے، فرائض پر بھی دھیان رکھے۔ وہ نہ اسلام کے شاندار سرمایے کے کسی قابلِ قدر حصے کو چھوڑنے پر آمادہ ہو نہ ہندوستان کے شاندار ماضی کے قابلِ قدر حصے سے علیحدگی پر فخر کرے۔ کبھی کبھی دوسروں کے راستے پر چل کر بھی اپنا راستہ ملتا ہے۔ کعبے کو ایک راستہ ترکستان ہو کر بھی جاتا ہے۔

آصفہ مجیب

"تاؤ"

اس تماشا گاہ عالم میں طرح طرح کے لوگ اور شخصیتیں ہیں۔ رنگا رنگ نقش و نگار۔ نئے روپ اور چھب۔ ایک آئینہ خانہ کہیے۔

ذرا تاؤ کو دیکھیے لانبا قد، دبلے پتلے سوکھے۔ پڑھنے لکھنے میں چھٹپن ہی سے ان کا جی نہیں لگا سدا کورے ہی رہے بس شد بد سیکھ گئے۔ نہ کوئی کام وام آیا۔ انھوں نے شادی نہیں کی۔ نہ کوئی آگے تھا نہ پیچھے۔ دنیا کے جھنجھٹوں بکھیڑوں اور آلائشوں سے آزاد مبرا اور منزہ تھے۔

پہلے تو ایسا بہت ہوتا تھا کہ خاندان میں کوئی ایک صاحب ثروت ہوتا تو بہتوں کی زندگی زیر سایہ بسر ہو جاتی۔ امیر غریب کی پہچان مشکل سے ملتی۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو پاتی۔ اب زمانہ اور ہے۔ اپنی اپنی پڑی ہے۔ مگر کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی پڑے ہیں۔

تاؤ کی ساری عمر شیخ اعظم کے یہاں بسر ہو گئی۔ جوانی سے بڑھاپے کی منزل آگئی۔ اور پتہ ہی نہ چلا کہ جوانی نے ایک شعلۂ مستعجل کی طرح کب چپکے سے منہ موڑ لیا۔ بہار کب آئی اور گئی۔ نہ مست ہوائیں چلیں، نہ پھول کھلے۔ نہ سوکھے ساون۔ نہ بھرے بھادوں۔

شیخ صاحب سے ان کا دور کا رشتہ لگتا تھا۔ ایک رکن خاندان کی حیثیت کے ساتھ ساتھ وہ بہ یک وقت کئی حیثیتوں کا مرکب مجموعہ نظر آتے تھے اور یہ سمجھنا دشوار سے دشوار تر تھا کہ یہ سلسلۂ دراز کہاں سے شروع ہوا اور کہاں پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

تنتنا اب بھی بہت تھا۔ پھرتیلے۔ کھٹ پٹ کسی نہ کسی کام میں جٹے ہی رہتے۔ کہیں جانا ہوتا تو جھٹ پنڈلیوں میں فوجی پٹیاں لپیٹ لیتے۔ اور جوتے کے فیتے کس کر نکلتے تو میلوں کی خبر

لاتے۔ ضرورت پڑتی تو پہاڑ پر چڑھ جاتے۔ چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں پر شکستہ سی کمانی کا چشمہ چڑھا رہتا۔ چوڑیدار پائجامہ لمبا کرتا اوپر سے کوٹ یا ویسکوٹ پہنے رہتے۔ کپڑوں کا رنگ کچھ اس قسم کا ہوتا تھا کہ اجلے اور ستھرے کم نظر آتے۔ نہاتے نہ معلوم کب تھے۔

آواز میں کڑک تھی۔ بعض وقت بچوں کو گھڑک دیتے تو سارا گھر دہل جاتا۔ اور ان کی شیر کی سی نگاہ سے سہم کر بچے اِدھر اُدھر دبک جاتے۔ ذرا ہی میں ایسے مہربان کہ شیر وشکر ہو جاتے کھلاتے ہنستے ہنساتے۔

شیخ صاحب سے عمر میں بڑے تھے مگر دل سے بڑی عزت بڑا احترام کرتے موج میں آتے تو سر فخر سے اونچا کر کے تعریفیں کرتے۔

"اجی میں یہ کہوں ہوں کہ کوئی آپ سے آپ بڑا آدمی نہیں بن جاتا۔ کوئی بات تو ہے میرے اعظم میاں میں جو اتنے بڑے رتبہ پر پہنچے۔ دیکھو اللہ نے دماغ کیسا دیا ہے دنیا مانتی ہے ان کو۔ اور محنت کا پھل تو ہمیشہ میٹھا ہووے ہے۔"

لمبا سا عالیشان مکان تھا۔ مگر ان کو اپنے لئے کسی خاص الگ جگہ کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں موقع دیکھتے پلنگ بچھا لیتے کبھی کہیں حفاظت کے خیال سے۔ کبھی کوئی بچہ اکیلا ہے اس کے پاس۔ سردی پڑ رہی ہو جب بھی برآمدے میں سو جاتے۔ کھانا کسی کے ساتھ نہیں کھاتے تھے۔ ملازم کشتی میں ان کا کھانا لگا کر فرش پر یا کہیں رکھ دیتا وہ سر جھکا کر کھا لیتے۔ کچی شکر بازار سے خود روز تھوڑی سی اپنے لئے ضرور لاکر کھانے میں ملا ملا کر کھاتے۔ کہتے "اجی اس کے بغیر تو میں چل ہی نہیں سکتا۔" گھر میں بچے بوڑھے، نوکر چاکر، آئے گئے سب انھیں تاؤ کہتے۔

اللہ رکھے مہمان رشتہ دار گھر میں آیا ہی کرتے۔ کسی نے قدم رکھا اور انھوں نے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ سلطانہ بیگم شیخ کے شاید چند اشارے اور جملے کافی ہوتے تھے۔ مہمان کی حیثیت مذاق اور موقع کے مطابق کھانے وغیرہ کا سب انتظام ہو جاتا۔ صاحب خانہ کی غیر موجودگی میں اتفاق سے مہمان آجائیں تو مہمان نوازی کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے۔

یہ بھی نہیں کہ شاہ خرچی کرتے ہوں۔ معاملہ بالکل برعکس تھا۔ پیسہ پیسہ پر نگاہ تھی۔ ایک دیاسلائی کی ڈبیا بھی کوئی ضائع کر دے تو پوچھ گچھ کرتے جھلّا اٹھتے۔ کسی نوکر کو سودا نہیں لانے دیتے تھے بھلا آج کل کے نوکروں کا کیا اعتبار لوٹیں کھائیں۔ گاڑھے پسینہ اور محنت کی کمائی پانی کی طرح بہادیں جب تک ان کے دم میں دم ہے کہیں ایسا ہو سکتے ہے۔

خود ہی بازار جاکر سر کھپاتے، مول تول کرتے، بازار کے بھاؤ کا اتار چڑھاؤ دیکھتے تب کہیں کوئی چیز خریدتے، پھل پھلاری نئی سبزی شروع میں جلتی جب تک مہنگی رہتی گھر میں نشان نہ ملتا چاہے بچے سر پٹخ ماریں۔ ٹال مٹول کرتے۔ جب مندی ہو جاتی جب ہی لاتے۔ امور خانہ داری کے تمام شعبوں میں ان کی مداخلت ناگزیر تھی۔ کہیں کہیں خود ان کی کارگزاریاں کارفرما ہوتیں۔ ورنہ گاڑی چلتے چلتے ایک دم کہیں پر اٹک جاتی۔ کام ٹھپ ہو جاتا اور گھر میں ایک انتشار اور ہیجان پھیل جاتا ایک پیالی چائے کسی کا پینے کو جی چاہے تو ان کا ہی منہ دیکھے ورنہ بیٹھا ترستا رہے۔

سب سے پہلے تو ایندھن جو وہ کوٹھری میں مقفل رکھتے تھے اور ایک انداز سے خانساماں کو روزانہ دیتے تھے اگر نہ دیں تو چولھا ہی نہیں جل سکتا تھا۔ کبھی ایسا بھی اتفاق ہو جاتا۔ یہ بھی وہ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے نہیں تو خانساماں کا کیا جاتا ہے چار ہی دن میں پھونک کے رکھ دے اسے پیسہ کا کیا درد۔ گھر پھونک تماشہ دیکھنا انھیں کسی حال میں گوارا نہ تھا۔

بچوں کا معاملہ نازک تھا۔ ایک دن صبح ہی صبح آفت پڑی چھوٹا بچہ جمّو ناشتہ میں انڈا مانگ رہا تھا تاؤ کو نہ معلوم کیا سر سمایا اسے انڈا نہیں دیا "جاؤ جاؤ انڈا ونڈا یہاں نہیں ہے میں کہاں سے لاؤں؟"

ہزار گھر میں مہمان سہی سب کچھ مگر اس نے دیکھا کہ اس کی پیٹھ پر کی بہن صبا باورچی خانہ میں پیڑھی پر بیٹھی مزے میں چپر چپر انڈا کھا رہی ہے بچے کے دل میں رشک و حسد کا شعلہ بھڑک اٹھا۔

"بچیہ کو کیوں دیا مجھے بھی دو۔" تاؤ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہاں صبا تو ان کی بڑی لاڈلی اور چہیتی تھی نا۔ بات یہ تھی کہ جب وہ پیدا ہوئی شیخ صاحب کو بڑا عہدہ ملا دن پر دن ترقی چین سکھ سب نصیب ہوا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کی پیدائش مبارک ہوئی اور جب ہی سے قسمت کا ستارہ آسمان عروج پر چمکا۔ کہتے تھے کہ بڑی نصیبہ ور لڑکی ہے میری بٹیا میری بٹیا کہتے اور جان چھڑکتے تھے۔

جمو بیچارہ رو دھو کر اسکول چلا گیا۔ سلطانہ بیگم کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ انھیں بہت دکھ ہوا تیوریوں پر بل پڑ گئے افسوس اور دکھ کے لہجہ میں بولیں:

آج میرے جمو کو تاؤ نے انڈا نہیں دیا۔ اندھیر ہے ایسے موے انڈے دنیا سے اڑ گئے۔"

تھوڑی رد و کد اور چاؤں چاؤں کے بعد پھر وہی معمولی ڈھرا شروع ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا چھوٹے بڑے ہر شخص نے ان معمولات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ بات اس سے آگے نہ بڑھ پاتی۔ نہ کوئی سوال تھا نہ جواب۔ طریقوں میں کچھ عجیب اعجاز تھا۔ حاکم و محکوم کا امتیاز عموماً جیسا ہوتا ہے اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ شائد یہ وہی عظیم الشان طاقت ہے جس میں کسی بے آسرا کو سہارا دینے، دلوں کو جوڑنے اور ملانے کی تاثیر ہوتی ہے۔ یوں ہی میوے سے لدی ڈالیں نیچے جھکی جھکی رہتی ہیں۔

صبا تاؤ کی آنکھوں کی تپلی تھی۔ بازار سے جب آتے اس کی پسند اور شوق کی کوئی نہ کوئی چیز لئے ہوئے۔ سب بچوں سے چھپا کر الگ اسے کھلاتے۔ میلے ٹھیلوں سے کھیل کھلونے لے آتے۔ گٹا پارچہ کا بوا۔ بطخ کو پانی میں تیرا کر تماشہ دکھاتے۔ گڑیوں سے الماری سجی تھی جمناسٹک دکھانے والا کھلونا وہ اس میں جب کوک بھر دیتے قلابازیاں کھاتا صبا کھل کھلا کر ہنستی تو اس کی شیریں ہنسی سے تاؤ کے سنسان دل میں مسرت کی جھنکار پیدا ہو جاتی۔ وہ خود محو تماشہ ہو جاتے۔ کہیں سے ایک خوبصورت پہاڑی مینا لے آئے۔ اسے تاروں کے پنجرے میں رکھا۔ طرح طرح

کی بولیاں سکھائیں۔ صبا بھی اس کے ساتھ مینا کی طرح چہکتی وہ اسے مینو کہتی۔ مینا کہتی "مینو گوندالاؤ" "میاں آئے... کھانا لگاؤ"۔ یہاں تک کہ وہ تاؤ کی طرح چھینکنے اور کھنکھارنے لگی نقل کرنے لگی جو سنتا وہی ہنس پڑتا۔ بڑے اہتمام سے بیسن بھون کر گرد ملا کر پنجرے میں کٹوری میں رکھ دیتے تسلے میں پانی بھر کر رکھتے اور مینا کو کھول دیتے وہ کھلبلا کھلبلا کر نہاتی۔ غوطے لگاتی صبا بڑی خوش ہوتی ہنستی، اسے پکڑ کر چومتی لپا ڈ کرتی "میری مینو، میری اچھی مینو"۔

تاؤ کھیل میں برابر کے شریک ہوتے اور دونوں ہی معصوم بچے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن جمو اگر مینا کو پکڑنا اور کھلانا چاہتا تو صبا چیختی "آں آں چھوڑ دو تم اس کی گردن مروڑ دوگے ائے مری میری مینو" جمو نے جل کر کہا "نہیں چھوڑ دوگی تو ایک دن بلی خالہ کی دعوت کر دوں گا بس رہ جاؤگی ہاتھ مل کر۔ نہیں تو پنجرا کھول دوں گا، پھر سے اڑ جائے گی... ہاں..."

صبا روانسی ہوگئی۔ دیکھئے تاؤ یہ کیا کہہ رہے ہیں... بلی کو... کھلا دیں گے....

تاؤ نے اسے گود میں لے کر چمکارا۔ صبا کا رونا انھیں کب گوارا تھا "رو نہیں بی بی۔ بلی کی ایسی تیسی بھلا مجال ہے جو پاس آئے موئی۔" صبا کہتی میری مینا ہے جمو کہتا نہیں میری ہے۔

تاؤ نے صبا کے کان میں چپکے سے کہا "تیری ہے" صبا خوش ہوگئی۔

ایک دن جمو نے شرارت میں سب کی آنکھ بچا کر پنجرہ کھول ہی دیا مگر تاؤ نے پہلے ہی اس کے ذرا ذرا سے پر کتر دئے تھے اڑ کے جاتی کہاں بیچاری۔

تلے اوپر کے بھائی بہنوں میں کبھی جھگڑا ہوتا ہی ہے مگر زیادہ تر تاؤ کے چڑھاوا اتار کے کارن ہوتا۔ جڑ فساد کی یہی ہوتی اور اس سے وہ باز نہ آتے۔ صبا سے ایک بڑا لڑکا اسلم تھا۔ سبھی بلوٹھی کی تھی۔ سب تاؤ کو تنگ مارتے اور صبا کو ستانے میں خاص لطف آتا تھا۔ اس کے کھیل کھلونوں پر اور کھانے پینے کی چیزوں پر جو وہ چھپا کر کھلاتے کبھی چوری چھپے کبھی کھلم کھلا حملہ کرتے۔ بھونے کاٹ کھاتے، توڑ دیتے۔ غبارے چھین کر ہوا میں اڑاتے اور

توڑ پھوڑ کر تماشہ دیکھتے۔ صبا کو حیران اور پریشان کرتے۔

اب تو خیر وہ پڑھنے لگی تھی مگر جب بالکل ننھی سی تھی بھائی بہن کی کتاب پنسل چھینتی تو تاؤ اس کے لئے کتاب کاپی پنسل لاکر رکھتے اپنے پاس بٹھا کر پڑھاتے "ہاں بٹیا پڑھ الف سے انڈا بے سے بکری" پنسل کاغذ پکڑا دیتے وہ تاؤ کی مہربان آنکھوں میں جھانکتی اور الٹی سیدھی چنگھیٹیاں کھینچتی تو وہ خوش ہو کر بولتے "او ہو ہو ارے شاباش کیسا اچھا لکھا میری بٹیا نے۔ بی اے ایم اے پاس کرے گی اوّل آئے گی چاہے دیکھ لینا اور اب تو کتابوں کاپیوں کی ڈھیری لگی رہتی۔ نئے نئے کلر بکس آتے جا بہ جا رنگوں کی گلکاریاں نظر آتیں۔ درخت پھول پتی جانوروں اور آدمیوں کی تصویریں کچھ نئے آرٹ کے مشابہ ہوتیں۔ تاؤ فخر سے سراہتے۔ کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے تصویروں کی نمائش سجا کے سب کو دکھاتے۔ اجی یہ تصویریں تو نمائش میں جائیں گی میری بٹیا کو انعام ملے گا۔

ایک دن صبا اور جمو میں کتاب پر جھگڑا ہو گیا۔ صبا نے نہیں دی یہ تاؤ میرے لئے لائے ہیں تم دوسری منگوا لو۔ تم چاہتے ہو میں نہ پڑھوں فیل ہو جاؤں۔ جمو کا منہ غصہ سے لال بھبوکا ہو گیا "جناب بھول گئیں میں نے آپ کو روشنائی نہیں دی تھی۔ میری روشنائی واپس کیجئے" صبا جھبرے جھبرے بال جھٹک کر تمسخر سے ہنسی۔

"کچھ گھاس کھا گئے ہو۔ وہ تو میں نے لکھ لی اب کیسے واپس کروں" جمو نے کتاب چھینی تو صبا نے ایک تھپڑ مارا اور جمو نے اس کے بال کھسوٹے دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ تاؤ اس وقت کہیں گئے تھے ورنہ صبا ہی کی بیچ کرتے اسلم اور سیمیں دونوں موقع واردات پر پہنچ گئے اور بیچ بچاؤ کیا۔

بات بڑھتی تو بچے ماں ہی کے پاس فیصلہ کرانے اور دکھڑا سنانے پہنچتے۔ ماں کی آغوش شفقت ہی اصل پناہ گاہ ہے۔ واقعہ کسی نوعیت کا ہو وہ تو انصاف ہی کرے گی۔ اس کی نظر میں سب بچے برابر ہیں۔ پوری پلٹن پہنچی۔

اگلی پچھلی شکایتیں دہرائی جانے لگیں۔ جمو ماں کی گود میں لیٹ گیا اور روانسا ہو کر بولا "امی یہ صبا صاحبہ بڑی وہ ہیں مجھ سے تو جو چیز مانگتی ہیں دے دیتا ہوں اور ذرا سی کتاب مجھے نہیں دی"۔ سلطانہ بیگم نے چمکارا۔ ارے مرد ہو کے روتا ہے۔ بہن سے لڑتا ہے تو بہ صبا تو نے کتاب کیوں نہیں دی؟

صبا ناز سے اٹھلائی "ہاں ایک دن ذرا سی روشنائی دی تھی اس پر خفا ہو گئے کہا میری روشنائی واپس کر۔ بھلا امی میں نے تو لکھ لی کہاں سے دیتی۔ میری کتاب چھین کر یہ پھاڑ ڈالتے تو میں کیا کرتی یہ تو چاہتے ہیں میں فیل ہو جاؤں تو میری ہنسی اڑائیں"۔

یہ کہہ کر ماں کے گلے میں جھول گئی سلطانہ بیگم نے پیار سے اس کے الجھے بال درست کرتے ہوئے کہا:

"چھوٹا بھائی ہے تیرا۔ ذرا دیر کو دے دیتی۔ اری پگلی تیری سسرال تجھے چوتھی لینے جائے گا۔ بھائیوں کے بیاہ میں بہت سا نیگ ملے گا۔ بیاہ میں جامہ نیمہ پہنائے گی اور سر پر آنچل ڈال کر جب دولھا بنیں گے روئے گی۔ بھتیجہ ہو تو سونے کے کڑے بھابی سے لینا"۔

صبا فرش پر چل گئی کڑے تیوروں سے جمو کو دیکھا "جمو کے ساتھ نہیں آؤں گی سسرال سے نہیں آؤں گی۔ بھابی کڑے دے گی تو پھینک دوں گی"۔

اس پر سب کو ہنسی آگئی۔ مگر سیمیں نے پیچھے سے ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر اصل موضوع چھیڑ دیا۔ "امی یہ تاؤ کی بڑی زیادتی ہے جمو کو کتاب لا دیتے تو یہ جھگڑا ہی نہ ہوتا۔ آپ تاؤ سے بلا کر پوچھئے۔ اسلم نے تائید کی" اور کیا جمو کی بات ٹال دیتے ہیں اور صبا کے لئے کیا پائیں کیا اٹھا لائیں۔ کتاب تو ضروری چیز ہے جمو تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا۔ میں لا دیتا"۔

سلطانہ بیگم کسی گہری فکر میں غلطاں و پیچاں تھیں۔ کسی کو کچھ سمجھا یا کسی کو کچھ۔ پیار و محبت کی پھوار سی ڈال رہی تھیں جس سے ان کے ننھے معصوم دل تازہ شگفتہ کلیوں کی طرح کھلتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی نظروں اور باتوں میں ایک کہانی سی سنائی دے رہی

امی جس کے لطف اور فیضان میں سب بچے ڈوب گئے۔ وہ پیار بھرے لہجہ میں دھیرے دھیرے کہہ رہی تھیں:

"ارے بیچارے تاؤ کو کچھ نہ کہو چھوڑو انھیں۔ پرانے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بچے اور بڈھے برابر ہو جاتے ہیں۔"

اسلم بولا "امی کیا بڈھے بچوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔؟"

"اور کیا یہ تو مشہور بات ہے۔ بلکہ بچے تو پھر سمجھ جاتے ہیں جیسے ماشاء اللہ تم لوگ ہو مگر بڈھوں کو سمجھانا کس کے بس میں ہے؟ لیکن ان کی عزت کرنا چاہئے کیونکہ انھوں نے دنیا دیکھی ہے پتہ کی اچھی اچھی باتیں بتاتے ہیں جو بچوں کو نہیں معلوم ہوتیں"۔

۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں انگریزوں نے غدر مچایا تھا جب کی اگلی پچھلی بھولی بسری باتیں ان کے دل میں سمائی ہیں وہی روح ہے۔ اس زمانہ کے لوگوں کو وہی سب باتیں پسند ہیں۔ اور صبا کو تو انھوں نے اپنی بیٹی بنایا ہے ان کے نہ کوئی بیٹا ہے نہ بیٹی نہ کوئی اور" یہ ٹیپ کا بند تھا جو بچے آنکھ کھلتے ہی سنتے چلے آرہے تھے۔ یہاں پر سناٹا چھا گیا۔ تینوں بچوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر ایک ساتھ صبا پر نظر پڑی۔ خیال ایک نقطہ پر آکر جم گیا۔ پھر صبا کے گرد توس قزح کا ایسا ہالہ بن گیا۔ گلابی فیروزی نارنجی کئی رنگ اس میں سے پھوٹ نکلے۔ صبا کے بالوں کی سی سنہری شعاعیں بکھرنے لگیں جیسے کینوس پر برش سے وہ جلدی جلدی تصویروں میں رنگ بھر رہے تھے۔ اور پھر کئی رنگ آپس میں گڈمڈ ہو گئے، کہیں مٹیالا جیسا تاؤ کا رنگ۔ کہیں بھورا ان کے کپڑوں جیسا۔ ان کی چندھی چندھی آنکھیں ان میں اتاد کا سفید پلکیں، جھریوں بھرا ہاتھ ابھرا جس میں لال لال چونچ والی مینا کا پنجرا تھرتھرا رہا تھا۔ تصویر اپنی اپنی جگہ استعداد کے مطابق مکمل ہو گئی۔

ماں کی پیار بھری باتیں دلوں اور دماغوں میں رس سا گھول رہی تھیں۔ تصورات نیا روپ جنم لے رہے تھے جس میں وہ روشنی اور توانائی بخش رہی تھیں۔ دنیا زیادہ نئی

اور واضح نظر آرہی تھی ۔ اور جس طرح نسیم سحری کے جانفزا جھونکوں سے نوشگفتہ کلیاں سورج کی کرنوں میں آنکھیں کھول دیں ان کے معصوم دلوں کی نیم وا آنکھیں کھل رہی تھیں۔
شیخ صاحب کبھی ایسے موقع پر ہوتے جب بچے کوئی شگوفہ چھوڑتے تو اکثر کہیں جانے کی جلدی میں ہوتے تھے بس ایک بڑا سا قہقہہ لگاتے جو دیر تک فضا میں گونجا کرتا۔
عموماً رات کو اگر کوئی مہمان نہ ہو تو بیوی بچوں کے ساتھ اطمینان سے بیٹھتے تھے۔ تاؤ بھی آ بیٹھتے۔

گلابی جاڑا پڑ رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ شیخ صاحب کھانا کھا کر ڈرائنگ روم میں تخت پر گاؤ تکیہ کا سہارا لگا کر بیٹھ گئے۔ گورے چٹے چہرے پر وجاہت مرحمت اور ایک خاص قسم کی شگفتگی تھی جو ان کی دلی کیفیت کی آئینہ دار تھی۔ بلند پیشانی، کنپٹی اور سر کے کچھ سفید بال بجلی کی تیز روشنی میں چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ چوڑیدار پائجامہ اوپر سے کشمیری ڈریسنگ گاؤن پہنے تھے۔ بڑے سے پیچوان کا حقہ بھر کے ان کے سامنے رکھ دیا گیا وہ لمبے لمبے کش لینے لگے۔ سلطانہ بیگم ادھر ادھر کاموں سے نپٹ کر پاس آ بیٹھیں غرارہ پہنے تھیں کامدانی کا چنا دوپٹہ اور ہلکی سی کشمیری شال کاندھے پر ڈالے ہوئے تھیں جو ان پر بہت کھل رہی تھی بچوں نے چاروں طرف سے آ کر ماں باپ کو گھیر لیا۔ ان کی باتیں جیسے بلبلوں کی زمزمہ سنجیاں تھیں۔ ماں باپ کے دل باغ باغ تھے۔ ذرا فاصلہ پر تاؤ گرم شیروانی پہنے دو زانو سر جھکائے مؤدب بیٹھے تھے اس وقت ان کی دنیا آباد تھی۔ شیخ صاحب ان کی بیوی بچے یہی ان کی جنت تھی۔ معلوم ہوتا تھا ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آ گئی۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اکثر اس وقت بچوں کی پڑھائی اور دن بھر کے کاموں کا جائزہ لیا جاتا۔

شیخ صاحب اسلم سے مخاطب ہوئے۔ "ہاں میاں اسلم مضمون تیار ہو گیا؟"
وہ سنانے کا منتظر تھا "جی ہاں لکھ لیا سناؤں؟" دبلا پتلا حسین نقش و نگار سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور مضمون سنانے لگا۔ باپ نے تحسین کی نظروں سے دیکھا "بہت خوب ماشاء اللہ

اچھا لکھتا ہے کیوں بیگم ؟ سلطانہ نے تائید میں سر ہلایا۔ "اس میں لکھنے کی اچھی صلاحیت ہے" تاؤ سر اٹھا کر بولے "اجی کس کا بیٹا ہے اچھا ہی لکھے گا" شیخ صاحب ہنسے "آپ تو یہی کہیں گے پھر مضمون میں کچھ اصلاح دے کر کہا "یہ آپ کے اسکول کے رسالہ میں چھپے گا"۔

گیارہ برس کے لگ بھگ سیمیں ماں کے گھٹنے سے لگی کھسر پھسر کر رہی تھی گلاب کی نازک کلی سی لگ رہی تھی شلوار اور پھولدار کرتا پہنے تھی۔ سلطانہ نے کہا "ذرا سیمیں کی کہانی تو سنئے کیسی چٹ پٹی ہے"۔ کہانی پر خوب خوب داد ملی۔ صبا اور جمو اپنی اپنی تصویریں دکھانے میں جٹے پڑے اور پھر تان آخر میں اس پر آکر ٹوٹی کہ جمو نے صبا کی روشنائی لات مار کر گرا دی سارا فرش ستیاناس کیا۔ کپڑوں پر الگ داغ ڈال دئے۔ جمو نے شکایت کی۔ بجیہ کو تاؤ نے سنترہ دیا۔ اکیلی چٹ کر گئیں ایک پھانک نہیں دی۔

شیخ صاحب نے پر معنی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گہری پیار کی نظریں بچوں پر ڈالیں۔

"بھئی جو چیز اپنی قسمت میں نہ ہو اس پر صبر کرنا چاہئے واویلا اور شور نہیں مچانا چاہئے۔ اور کوئی چیز کسی کو ذرا زیادہ مل جائے تو اس کا برا کیا ماننا"۔

سلطانہ بیگم نے اون کے پھندے تیلیوں پر برابر کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"مساوات کا زمانہ جمہوریت ہے۔ سب کے حقوق برابر ہیں"۔

شیخ صاحب ہنسے۔ "یہ تو آپ نے ٹھیک کہا مگر کیسے مانوں کہ انصاف نہیں ہوتا۔ تاؤ آپ تو سب ہی کو برابر سمجھتے ہیں سب آپ کے بچے ہیں۔ صبا بچاری تو عبث بدنام ہے"۔

تاؤ بار بار چلم کی آگ پھونک کر آنچ تیز کر رہے تھے۔ اس کے عکس سے ان کے چہرے کا مٹیالا رنگ شعلے کی طرح دہک رہا تھا۔ اس میں ان کے دل میں جو آگ بھڑک رہی تھی وہ بھی شامل تھی۔

ہنس کر بولے "تم کس کی باتوں میں آتے ہو۔ اجی یہ آپی آپ لڑیں جھگڑیں ہیں۔ اللہ کے

مستقے سے کسی چیز کی کمی نہیں ہے خوب کھا دیں بیویں ہیں بن تحق کو ہلڑ مچا دیں ہیں۔ صبا سے تو کوئی چیز چھپنے بنا رہتے نہیں۔ کبھی کبھار کچھ دے دیتا ہوں محنت بہت کرے ہے اتنا سر پر ہے اور میرے تو سب ہی بچے ہیں۔"

شیخ صاحب کا ایک قہقہہ کمرے کی فضا میں، لہرایا حقہ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ سلیم شاہی جوتیاں پیر میں ڈالیں اور بچوں کو پیار کر کے اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔ نشست برخاست ہوئی۔

درگذر مروت، وضع داری کا یہ تانا بانا جس میں پرانی تہذیب وتمدن اور معاشرت کے دل آویز نقش ونگار اور گل بوٹے بڑی جانفشانی اور دیدہ ریزی سے جانے کن کن مقدس ہاتھوں نے کاڑھے تھے قیمتی اثاثہ کی طرح وہ اپنے سینوں سے لگائے تھے۔ کبھی بکھرنے اور بگڑنے نہ پاتا۔ وہ اسے سنوارتے۔ کچھ اور تابدار اور تابناک نظر آتا۔

مگر اب بچے بڑے ہو رہے تھے ان کے سامنے تاؤ کی زیادہ نہ چلتی۔ بچے من مانی کرالیتے کبھی تاؤ کو زک اٹھانی پڑتی اور وہ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

کہیں سے آموں کا ٹوکرا آیا۔ گھر میں مہمان تھے۔ تاؤ روز پکے آم چھانٹ کر دسترخوان پر لگوا دیتے لیکن بچوں کا دل ہر وقت آموں ہی میں پڑا رہتا۔ صبا کا حصہ ظاہر ہے زیادہ تھا وہ تاؤ کے ساتھ کوٹھری میں گھس جاتی اور چوسنے لگتی۔ کبھی تاؤ قاشیں کاٹ کر کھلاتے ویسے کوٹھری میں حسب دستور تالا پڑا رہتا۔

ایک دن بچوں نے سازش کی کہ کسی طرح آموں پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ تاؤ جب کہیں چلے گئے۔ بچے ترکیبیں سوچنے لگے اس میں مہمان بچے بھی شامل ہو گئے پہلے تالا کھولنے کی کوشش کی اس میں ناکامی ہوئی۔ ایک کھڑکی تھی اسے دھکے دے کر کسی نہ کسی طرح کھول لیا اور اندر گھس گئے۔ صبا بھی ان سب میں مل گئی۔ سب آموں کے ٹوکرے پر پل پڑے۔ کچے پکے کچھ کھائے کچھ مٹھیوں میں دبائے اس حال میں نکل رہے تھے کہ تاؤ وارد ہو گئے۔ دیکھا تو معاملہ

ہی دگرگوں ہے۔ چاروں طرف چھلکے اور گٹھلیاں پڑی بھنک رہی ہیں وہ برہم ہو کر چلائے
"یہ کیا کیا آموں کا ناس کر دیا۔ کیا تم روز آم نہ پاؤ ہو۔ الٰہی توبہ"۔

بچے ہاتھ منہ سانے وہاں سے بھاگے۔ تاؤ نے صاف دیکھا کر بھاگنے والوں میں صبا بھی تھی یعنی چوری اور توڑ پھوڑ میں سب کے ساتھ شریک تھی۔ ان کو عجب دھکا سا لگا۔ دنیا اپنے گرد چکراتی معلوم ہوئی وہ سر پکڑ کر چپ چاپ اپنی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہاں گھٹنا ہمیشہ پیٹ ہی کی طرف جھکتا ہے۔ صبا بھائی بہنوں سے مل گئی ان کے خلاف توقع۔ مگر اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ پھر ایک لفظ انھوں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔

کچھ عرصہ بعد تاؤ کے سامنے زیادہ اہم مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسلم اور سیمیں اب کالج میں پڑھتی تھی۔ سیمیں وہ گلاب کی کلی اب نوشگفتہ پھول تھی۔ گلگوں دہکتا سا رنگ سرو نازک سی زولیدہ غزالی آنکھیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت آزادی لڑکیوں کا حق ہے جو ماں باپ کو دینی پڑتی ہے۔ سیمیں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ادھر ادھر جاتی تفریحی اور تعلیمی پروگراموں میں شریک ہوتی۔ سب سے ملنا جلنا۔ کبھی اپنے گھر دعوت پارٹی کرتی اکثر لڑکے بھی شریک ہوتے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بات چیت کرنا۔ یہ سب باتیں تاؤ کو کھٹکتی تھیں۔ صبا تو ابھی چھوٹی تھی لیکن سیمیں پر وہ کڑی نظر رکھتے۔ کس وقت کہاں گئی۔ آنے میں دیر ہوئی تو پریشان ہیں بڑبڑا رہے ہیں۔

"بس اب بہت پڑھ لیا کیا اسے نوکری کرنی ہے۔ گھر میں جیتا ہی نہیں لگتا۔ ایسی تعلیم اور ایسی آزادی کو سات سلام" اور یہ سوچ کر روح لرزا کرتی کہ ابھی الھڑ ہے کہیں خدانہ کرے اونچا نیچا قدم پڑ جاوے تو پشتوں کی عزت آبرو اور نام پر بٹہ لگ جاوے"۔ فون کرتی تو سنتے کہ کسے کر رہی ہے۔ ایک دن ٹیلی فون پر اسلم کا ایک دوست بات کر رہا تھا۔ تاؤ بولے:

"بیٹی زرا کڑک کر بول۔ لڑکوں سے ایسی نرمی سے مت بولا کر"۔ سیمیں چپکے سے کھوں سے ہنسی تاؤ کے دماغ رسا میں غیب سے کیا کیا نئے نئے خیالات آتے ہیں۔ حد ہے بس ان سے۔

شام کا خوشگوار وقت تھا ایک نوجوان جلد جلد قدم بڑھاتا کوٹھی میں داخل ہوا۔ سیمیں

سے کہیں بس پر اس سے ملاقات ہوئی تھی حضرت نے پتہ پوچھ کر نوٹ کر لیا اور اس وقت ملنے پہنچے۔ شوئی قسمت سے پہلے تاؤ کا سامنا ہو گیا انھوں نے سر سے پیر تک گھور کے دیکھا۔

"کہاں سے آئے ہو کیا کام ہے؟"

نوجوان کچھ ہچکچایا۔ تاؤ کے تیور اور لہجہ سے دل لرز اٹھا۔ جھجک کر جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

"یہاں شیخ صاحب کی صاحبزادی سیمیں ہیں ان سے ملنا ہے۔"

تاؤ کے تن بدن میں آگ لگ گئی تف ہے ایسی آزادی پر جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام پھٹکار کر بولے "میاں ہوش کی دوا کرو۔ بن نحق اتنی تکلیف آنے کی کی۔ لے بھلا ہم آپ کو جانیں نہ پہچانیں۔ سیدھے طریقے سے شیخ صاحب سے ملنے کو کہو تو لے چلوں"۔

نوجوان نے ملنے کی امید میں پاسبان کی جھڑکیاں سہہ لیں کہا "بہت اچھا" اور کسی شدید جذبہ کے تحت کشاں کشاں تاؤ کے پیچھے ہو لیا۔

شیخ صاحب لان پر ٹہل رہے تھے۔ سبزہ لہک رہا تھا۔ ہوا مستی سے محو خرام ناز تھی کیاریوں میں رنگ برنگی پھولوں کی بہار تھی۔ جمو اور صبا اور کچھ بچے بیڈمنٹن کھیل رہے تھے مگر وہ نوبہار ناز جسے نوجوان کی نظریں چاروں طرف ڈھونڈھ رہی تھیں کہیں نہیں تھی۔ سیمیں اپنے موسیقی کے استاد سے ستار پر غالب کی یہ غزل سیکھ رہی تھی۔

شبنم بہ گل و لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغ دل بے درد نظرگاہ حیا ہے

موسیقی کی ہلکی ہلکی دلکش تانیں فضا میں لرزاں اور رقصاں تھیں جن میں تڑپ تھی سوز و سرور شیخ صاحب نے لڑکے کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ باتیں چھڑیں وہ روشن خیال تھے زمانہ کے رخ کو بھی پہچانتے تھے مگر جس سلسلہ میں وہ سیمیں سے ملنے آیا۔ اس کا یہ اقدام کچھ مستحسن نہیں معلوم ہوا۔ لڑکا بھی بس ایسا ہی ویسا لگا ان کے چہرے پر زرا

ناگواری کے آثار نمودار ہوئے انھوں نے کہا "ہمارے خاندان میں لڑکیوں کے اس طرح آزادانہ ملنے جلنے کا رواج نہیں ہے۔" وہ ایک باتیں ادھر ادھر کی کرکے اسے ٹال دیا۔ سیمیں کو نہیں بلایا۔ نوجوان کی امیدوں پر پانی پھر گیا غریب شرمندہ ہوکر اٹھ گیا۔ ادھر تاؤ سینہ تانے کھڑے تھے وہ چلا گیا تو جی میں ٹھنڈک پڑی۔ اطمینان کا سانس لیا۔ دل ہاتھ بھر کا ہوگیا۔ ان کی بات رہ گئی۔ بیچارے انہی اندیشوں میں گھلا کرتے موقع نصیحت فضیحت سے نہ چوکتے یہاں تک کہ بعض وقت سلطانہ بیگم کو انھیں بچوں کی طرح سمجھانا پڑتا۔

"تاؤ آپ ایسے نہ کہا کیجئے ہماری لڑکیاں اعلیٰ تعلیم پا رہی ہیں بڑے بڑے لوگ ان کی قدر کرتے ہیں یہ خوشی کی بات ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ گھر سے قدم نہ نکالیں ان میں خود اچھا اور برا سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے ہم پیچھے کیسے لوٹا سکتے ہیں۔" تاؤ سر جھکاؤ کر کے سن لیتے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تاؤ اور سلطانہ بیگم کی رائے متفق ہوجاتی۔ آج کل کچھ مہمان لڑکے ٹھہرے تھے سب نے صبح کو پکنک پر جانے کا پروگرام بنایا۔ تاؤ کو سیمیں کا ان کے ساتھ جانا ناگوار تھا وہ یہی پٹی پڑھا رہے تھے کہ اسے نہ جانا چاہئے سلطانہ بیگم خود لڑکوں کو کچھ پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھتی تھیں دونوں کا مشورہ ایک ہوگیا۔ صبح کو تاؤ نے بڑے زوروں میں اعلان کیا کہ "سیمیں پکنک پر نہیں جائے گی"۔ لڑکوں پر بجلی سی گر پڑی۔ سارا لطف خاک میں مل گیا۔ سیمیں اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی یہ فیصلہ سن رہی تھی وہ چپ چاپ اندر چلی گئی اس کے دل پر کیا گذری اس کا کسی کو پتہ نہیں شائد ماں نے پہلے ہی سمجھا بجھا دیا تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

تاؤ کبھی کبھی روٹھ بھی جایا کرتے۔ ان کا نازک شیشہ کا ایسا دل ذرا سی ٹھیس سے چکنا چور ہوجاتا۔ خفگی کا جب یہ دورہ پڑتا وہ منہ اوڑھ کر بستر پر پڑ جاتے۔ نہ کچھ کہتے نہ سنتے کھانا پینا چھوڑ دیتے۔ بے سدھ پڑے رہتے۔ پھر چاہے سارا گھر مناتا نہ مانتے سوا شیخ صاحب کے تب ساری خفگی اڑن چھو ہوجاتی۔ لیکن اتفاق سے وہ کہیں باہر

گئے ہوں تو کئی کئی دن اسی حال زار میں گذر جاتے۔ سب پریشان ہوتے دلوں پر بوجھ ہوتا
مگر کچھ بنائے نہ بنتا۔ سب آآ کر حسرت سے دیکھ جاتے۔ حتیٰ کہ صبا کی بھی کچھ نہ سنتے وہ خوشلد
کرتی "تاؤ اٹھئے کھا یئے۔ یہ بات وہ بات" مگر وہ نہ سنتے۔ ذرا سامنہ کھول کر اسے دیکھ لیتے
جا بٹیا جا میرے کو بھوکھ نہیں ہے۔ جی اچھا نہیں ہے۔ وہ روانسی ہو کر لوٹ آتی۔

آج صبح سے تاؤ کو وہی دورہ پڑا تھا۔ شیخ صاحب دفتر جا چکے تب پتہ چلا۔ سب سمجھ گئے کہ
آج آفت نازل ہوئی۔ ناگواری کا سبب بھی کچھ نہیں کھلا کہ بات کیا ہے کس سے ناراض ہیں۔
کچھ کہتے تو تھے نہیں۔ معلوم ہوتا ایک مردہ پڑا ہے۔ اپنی اپنی جگہ سب اپنے کو مجرم سمجھ رہے
تھے کہ جانے کس نے کیا کہا، کس سے کیا قصور سرزد ہوا۔ سلطانہ بیگم کے چہرے پر فکر کی پرچھائیاں
سی پڑ رہی تھیں وہ بار بار آکر دیکھتیں۔ شیخ صاحب کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔
آج ان کا لنچ باہر تھا۔ کہیں رات کو آئیں گے اور نہ معلوم کتنی دیر میں آئیں۔ یہاں ایک
ایک پل بھاری تھا۔ دل میں کانٹا سا کھٹک رہا تھا۔ سب کھا پی رہے ہیں تاؤ جن کا دنیا میں کوئی
سہارا نہیں جنھوں نے ان کے دامن عافیت میں پناہ لی۔ ان کے لئے دکھ جھیلے۔ دن کو دن
رات کو رات نہ جانا۔ بچوں کو پالا پوسا۔ بے آب و دانہ پڑے ہیں۔ بچے بھی گم سم تھے۔
ہنسی قہقہے مدھم پڑ گئے تھے۔

دوپہر ڈھل گئی۔ سورج دن بھر کی مسافت کے بعد تھکا ہارا مغرب کی طرف لوٹ
رہا تھا۔ اس کی زرد بیمار سی کرنیں آڑی ترچھی تاؤ پر نڈھال ہو کر پڑ رہی تھیں۔ تاریکی اپنا دامن
پھیلا کر ان کی تاریک دنیا کو اور تاریک بنا رہی تھی۔

سلطانہ کے پاس ان کی کچھ ملنے والیاں بیٹھی تھیں بات چیت کے دوران سلطانہ کا
خیال ادھر ہی بھٹک جاتا اور نظریں خود بخود راستہ کی طرف اٹھ جاتیں کہ شاید شیخ صاحب
آ رہے ہیں۔ یہ مصیبت کٹے۔ ان کی دوست جانے کے لئے اٹھیں تاؤ کو پڑا دیکھ کر پریا نے
رازدارانہ انداز سے پوچھا "کیوں بھابھی کیا تاؤ پڑے ہیں بیچارے یہ کب سے؟" سلطانہ بیگم

نے متفکر نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا:
"بہن میچ سے یہ وقت آگیا" یہ راز سربستہ آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
بیگم ظہیر نے اپنا ٹھونکا "ہائے میرے اللہ جب سے پڑے ہیں" پھر بڑے حوصلہ سے بولیں
"اچھا چلو آج میں خوشامد کر کے مناؤں گی۔"
سلطانہ بیگم نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "ساری عمر سب کچھ کر کے ہار گئے مگر یہ گتھی نہیں سلجھی یہ درد لا دوا ہے۔ آپ کیا کرلیں گی۔
بیگم ظہیر ہنسیں یوں نہ کہئے۔ مسیحا تو اللہ رکھے موجود ہیں۔" وہ جو بیچتے تھے دوائے دل" انھوں نے اپنی دوکان نہیں بڑھائی ہے۔ سجائے بیٹھے ہیں آتے ہوں گے اور ابھی نہ معلوم کتنوں کو شفا بخشتے ہوں گے انہی پر کیا موقوف۔
دن بھر کے بعد سلطانہ بیگم کے چہرے پر ایک دل خوش کن مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
آج شیخ صاحب کو خلاف معمول آنے میں دیر لگی۔ کھانا کسی نے نہیں کھایا یہاں تک کہ بچے بھی باپ کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ سارا گھر مبہم سی خلش میں مبتلا تھا۔
اتنے میں بارہ بجا شیخ صاحب کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب اِدھر اُدھر سے آکر دیکھنے لگے۔ فضا میں ایک مسموم اداسی اور سناٹا محسوس کرکے شیخ صاحب متجسس نظروں سے سب طرف دیکھنے لگے۔ سلطانہ بیگم فوراً اپنے کمرے سے نکل آئیں حیران اور مغموم، شیخ صاحب نے غور سے دیکھا اور فکر مندانہ انداز سے بولے خیر باشد بیگم بہت گھبرائی لگ رہی ہو۔ آج مجھے بہت دیر ہوگئی بچوں نے کھانا وانا کھایا۔
جی کھانا وانا کیسا۔ میں تو بڑی دیر سے آپ کی راہ تک رہی تھی۔ آج صبح سے تاؤ خفا پڑے ہیں۔
شیخ صاحب ایک دم کھڑے سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ تشویش سے پیشانی پر تھکاوٹ

کے ساتھ ہاتھ پھیرا۔

اچھا یہ معاملہ ہے ..... تو پھر میں چلتا ہوں۔ آپ ان کے لئے کھانا منگوا لیجئے جلدی سے آپ بیٹھ جائیے۔

ملازم تو منتظر تھے ہی اور سارے قاعدوں سے واقف تھے۔ کشتی میں سب کھانا لگا کر حاضر کیا اور شیخ صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ انھوں نے کشتی دونوں ہاتھوں میں اٹھالی ا تاؤ کے پلنگ کے پاس آکر ہلکی سی آواز دی "تاؤ اٹھئے"

ان کے کان میں جیسے ہی یہ جان بخش آواز پہنچی کھڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ الاالله کہا۔ شیخ صاحب نے کشتی ان کے سامنے لگا دی اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ شیخ صاحب نے جلدی سے سر جھکا کر کھانا شروع کر دیا۔ دوائے درد دل مل گئی۔ جی اٹھے۔ معلوم ہوتا تھا ان کے لئے آسمان سے من وسلویٰ اترا ہے۔ شیخ صاحب اپنی دیرینہ خدمت انجام دے کر چلے آئے۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ کھانا میز پر چن دیا گیا تھا۔ سب نے کھانا شروع کیا۔

تاؤ کی خفگی، غم، غصہ جانے کہاں سب دھول ہو گیا۔ دل کی دنیا بدل گئی۔ کھاپی کر اٹھ پڑے۔ کھٹ پٹ اپنے کاموں میں لگ گئے بولنے چالنے لگے۔ "ارے اعظم میاں کے لئے حقہ بھر دیا یا نہیں ؟" ملازم نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا "تاؤ آپ ہی بھر دیجئے آکر" "آیا بھئی آیا" بچے بھی اس وقت کچھ زیادہ ہی ہنس بول رہے تھے سب طرف وہی رونق اور چہل پہل نظر آنے لگی۔

ایک بجھے ہوئے چراغ کو روشن کر کے دلوں کی شمعیں جگمگا اٹھیں۔ اور یہ وہی روشنی تھی جس سے تاؤ کسب نور کرتے تھے۔ انھیں اب ہر طرف چراغاں ہی چراغاں نظر آرہا تھا۔

یوں ہی چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔

کوائف جامعہ

جامعہ کے معزز مہمان

جامعہ کے کاموں کو دیکھنے اور اساتذہ سے ملنے اور علمی و تعلیمی مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کے لیے مہمان آتے رہتے ہیں، ان میں بڑی تعداد بیرونی مہمانوں کی ہوتی ہے جو خاص طور پر اسلامی مسائل پر کام کرنے یا تحقیق کرنے کے لیے ہندوستان آتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان مہمانوں کو وقتاً فوقتاً قارئین جامعہ سے بھی ملایا جائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ آج کل ہندوستان اور اسلام پر کتنا مفید کام ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی مختلف اسکالروں کے رجحانات اور میلانات کا بھی اندازہ ہو سکے گا، مگر ماہنامہ جامعہ کی تنگ دامانی ہماری اس خواہش میں حائل ہے۔ لیکن اگر مستقل طور پر نہیں تو کبھی کبھی تو بعض خصوصی مہمانوں کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے:

دارالمصنفین کے ناظم اعلیٰ مولانا حاجی شاہ معین الدین ندوی صاحب غالب صدی کی تقریبات میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لائے تھے تو چند روز جامعہ میں بھی اپنے احباب کے ساتھ قیام فرمایا اس مختصر قیام میں شیخ الجامعہ صاحب اور دیگر اساتذہ سے ملے، جامعہ کے کاموں کو دیکھا اور ان کے بارے میں گفتگو کی۔ یہاں سے واپس جانے کے بعد معارف (بابت مارچ ۶۹ء) میں انھوں نے جن تاثرات کا اظہار فرمایا ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس مرتبہ عرصے کے بعد جامعہ ملیہ جانے کا اتفاق ہوا، کئی دن قیام رہا، احباب جامعہ کے ساتھ بڑا پر لطف وقت گذرا۔ جامعہ کی تعمیری ترقیوں کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی، اس کی پوری تاریخ نگاہوں کے سامنے آگئی۔ اب جامعہ کے مصارف کا دارومدار تمام تر حکومت

کی اعانت ہے، اس لیے نئے حالات سے اس کا متاثر ہونا اور کسی۔ کسی حد تک اس میں تبدیلی ناگزیر ہے، جس سے کوئی سرکاری ادارہ بھی مستثنیٰ نہیں ہے، لیکن جامعہ کی حیثیت دوسری تعلیم گاہوں سے مختلف ہے، اس کا قیام ہی آزاد قومی تعلیم کے لیے عمل میں آیا تھا، اس لیے اس کے نظام تعلیم میں زیادہ تبدیلی کی ضرورت نہیں اور اس کی قوم پروری کی روایات اتنی شاندار ہیں کہ ان پر کوئی حرف نہیں آ سکتا، اس لیے اپنی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے نئے حالات کے مطابقت میں اس کے لیے زیادہ دشواری نہیں ہے۔"

ابھی چند روز ہوئے جامعہ کے ہمدرد اور بہی خواہ جناب شہاب الدین دسنوی صاحب پرنسپل صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ، ایک کام سے دہلی تشریف لائے تھے تو جامعہ میں بھی کچھ وقت گذارا اور مختلف موضوعات پر گفتگو کی۔ دسنوی صاحب بمبئی کے ان لوگوں میں سے ہیں، جن سے جامعہ کے کاموں میں بیش از بیش مدد ملتی ہے اور ان کی مدد کے بغیر کم از کم بمبئی میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ موضوع سے جامعہ کے جشن زریں کا بھی ذکر آیا اور انھوں نے اس ارادے پر اپنی پسند اور مسرت کا اظہار فرمایا اور پوری طرح مدد کرنے کا وعدہ فرمایا۔

جناب معین الدین حارث صاحب (مدیر روزنامہ اجمل بمبئی) آج کل آئے ہوئے ہیں۔ موصوف جامعہ کے ان چند مخصوص اور ممتاز طلبائے قدیم میں سے ہیں، جن کا جامعہ کی ترقی و تعمیر میں بہت بڑا ہاتھ ہے، انھوں نے ہمیشہ اور ہر موقع پر جامعہ کے ان تمام کاموں میں غیر مشروط اور مخلصانہ مدد کی ہے جن میں ان کی مدد چاہی گئی، بمبئی اور اطراف بمبئی میں تو ان کے بغیر کوئی کام کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جامعہ کے جشن زریں ـــ گولڈن جوبلی کی ہم سے زیادہ انھیں فکر ہے، ایک عرصے سے اس کی یاد دہانی کرتے رہے ہیں اور مختلف پروگراموں اور منصوبوں کے مشورے دیتے رہے ہیں۔ فروری کی ابتدائی تاریخوں میں شیخ الجامعہ صاحب اور ہم میں سے چند لوگ بمبئی گئے تھے تو اس وقت بھی جشن زریں کا ذکر آیا تھا اور آج کل تشریف لائے ہیں تو اس پر بہت تفصیل سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اس مرتبہ پہلے سے زیادہ وقت نکالنے اور مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

اسلامی معلومات ۔حصہ اول وحصہ دوم

مولوی حافظ بدرالدین صاحب دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور گریجویٹ ہیں اور مدرسہ ابتدائی میں دینیات کے استاد ہیں، بڑے مخلص اور مرنجان مرنج آدمی ہیں۔ انھوں نے نوعمر مسلمان بچوں اور بچیوں کے لیے "اسلامی معلومات" کے نام سے دو حصوں میں آسان زبان میں کتابیں لکھی ہیں جس میں اسلامی تعلیمات کی قریب قریب تمام ضروری باتیں آگئی ہیں۔ مثلاً پہلے حصے میں مختصراً اسلام کے بارے میں ہے، پھر نماز اور متعلقات نماز کے بارے میں اور آخر میں آنحضرت صلعم کے آٹھ ارشادات ہیں، دوسرے حصے میں عقائد کے دوسرے مسائل ہیں جیسے قیامت، تقدیر، مرنے کے بعد زندہ ہونا وغیرہ، پہلے حصے میں خود فاضل مولف نے اپنے اور اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"میری زندگی کے بارہ سال جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ۶ سال سے ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں بچیوں کو دینیات پڑھانے میں گذرے ہیں۔ اس دوران میں میں نے سیرت النبی، خلفائے راشدین کی تاریخ اور عام مسائل پڑھائے، جس میں مجھے بچوں کی تعلیم، ان کی نفسیات، ذہنی صلاحیت اور قابلیت کو کافی سمجھنے کا موقع ملا۔ میں نے محسوس کیا کہ موجودہ دور میں سیرت النبی اور تاریخ اسلام کی تو بہت سی ایسی کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ جو اس عمر کے بچوں کی ذہنی صلاحیت کے مطابق ہیں، البتہ اسلامی عقائد اور فقہی مسائل میں ایسی کتابیں میری نظر سے نہیں گذریں جو بچوں کی اس عمر کے تقاضوں کو پورا کرتی ہوں۔ اس دشواری (ضرورت) کے پیش نظر میں نے عقائد، مسائل اور معاملات کی کتابوں کا سلسلہ شروع کیا۔"

جامعہ کالج کے استاد مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی نے اس کتاب کے بارے میں لکھا کہ:

"... میں نے متعدد مقامات سے دونوں حصوں کو پڑھا ہے، جہاں تک میری نظر گئی میں نے ان کو مفید اور دلچسپ پایا۔ زبان بھی سادہ اور سلیس ہے اور مسائل بھی معتبر ہیں، انداز بیان بھی بڑا محتاط ہے ـــــ مسلمان بچوں کے علاوہ جو غیر مسلم اسلام کی تعلیمات کو سرسری طور پر سمجھنا چاہیں، ان کے ہاتھوں میں یہ رسالے بے تکلف دئے جاسکتے ہیں۔"

پہلے حصہ کی قیمت پچاس پیسے اور دوسرے حصہ کی قیمت ۹۰ پیسے ہے

ملنے کے پتے : (۱) ادارہ اشاعت دینیات، حضرت نظام الدین۔ نئی دہلی ۱۳

(۲) قومی کتاب گھر، دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)

(عبداللطیف اعظمی)

جامعہ

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کی یاد میں

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس پیسے

جلد ۵۹	بابت ماہ جون ۱۹۶۹ء	شمارہ ۶

فہرست مضامین

طابع و ناشر : عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ : یونین پریس دہلی   ٹائیٹل : نیال پریس دہلی

آہ امیر جامعہ!

۳ مئی ۱۹۶۹ء کو صبح ۱۱ بجکر ۲ منٹ پر ہمارے مرشد، ہمارے مربی اور رہنما ڈاکٹر ذاکر حسین اپنی حیات مستعار کے ۷۲ برس گذار کر اپنے رب سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون. ڈاکٹر صاحب خدا کے ایسے برگزیدہ بندے تھے جنھیں مشیت نے اس کام کے لئے چُن لیا تھا کہ وہ ایک پوری جماعت، پوری قوم کی آبرو بن جائیں، ایسے برگزیدہ انسانوں کو قدرت کی طرف سے ایسی طبیعت، ایسا دل ملتا ہے جو عبودیت اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار رہتا ہے، ایسی طبیعتوں کو سوز و گداز کی دولت ملتی ہے اور وہ اسے اپنے پیدا کرنے والے کی طرف سے سب سے بڑا انعام تصور کرتی ہیں، یہ وہ دولت ہے جس سے اِن طبیعتوں میں وہ استغنا پیدا ہوتی ہے کہ چاہے امیری کی حالت ہو، چاہے فقیری کا عالم، اس استغنا کی زرہ انھیں ہر صورت میں محفوظ رکھتی ہے،

بلاشبہ ذاکر صاحب عظیم تھے، جب تک جئے، اور ہر حالت میں خندہ جبینی کے ساتھ جئے، عظمت اُن کے قدم چومتی رہی اور جب مرے تو عظمت اُن کے جنازے کے ساتھ چلتی رہی، یہ کوئی معمولی بات نہیں، یہ عظمت اسی کو ملتی ہے جو عظمت کا متلاشی نہ ہو، یہ عزت اسی کے نصیب میں ہوتی ہے جو عزّت و ذلّت کا معاملہ خدا کو سونپ کر اس سے کچھ کر جانے کی توفیق کا طالب ہوتا ہے اور بس، اس سے زیادہ کچھ اور نہیں چاہتا، بندگی اور اطاعت کے اسی جذبے کی دولت ملی تھی ہمارے ذاکر صاحب کو، اور یہی وجہ ہے کہ اس بندۂ حق آگاہ و اطاعت گذار کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن گیا تھا، .... اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے سے زمین شور

میں ہل چلوایا اور تعلیم ملی کے اس ادارے کی تعمیر کا کام لیا جو آج اس مردِ مومن کی فہم و فراست، ایثار و قربانی، سعیِ مسلسل اور جہدِ پیہم کی زندہ یادگار ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشنِ سیمیں کے موقع پر حفیظ جالندھری نے ایک نظم پڑھی تھی، اس کے دو شعر حافظہ میں محفوظ رہ گئے ہیں:

زمینِ شور پر ہل چل رہا ہے خشک سالی میں — کمی کرتا نہیں خونِ جگر دریا نوالی میں
یہ ملت جب کبھی اپنی زیاں کاری کو جانے گی — وجود اس جامعہ کا معجزے سے کم نہ مانے گی

ذاکر صاحب نے اپنی زندگی کا بہترین زمانہ، یعنی جوانی کا زمانہ جامعہ ملیہ کی تعمیر میں صرف کیا، ذاکر صاحب نہ ہوتے تو ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی، علی برادران اور دوسرے قومی رہنما علی گڑھ سے مایوس اور دل شکستہ واپس ہوتے، ذاکر صاحب نہ ہوتے تو شیخ الہندؒ کا وہ تاریخی خطبہ کہاں ہوتا جس کی یہ ابتدائی سطریں آج بھی دلوں کو گرماجاتی ہیں:

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔"

اور ہاں، جامعہ کہاں ہوتی اگر ذاکر صاحب نے ۱۹۲۴ء میں جب جامعہ کے ٹرسٹیز نے جامعہ کو بند کردینے کا ارادہ کرلیا تھا، اپنے چند مخلص احباب کو جرمنی سے یہ نہ لکھا ہوتا کہ "میں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کو تیار ہیں۔ ہمارے آنے تک جامعہ ملیہ کو بند نہ ہونے دیا جائے۔"

۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ جرمنی سے واپس آئے۔ اس اثنا میں حکیم اجمل خاں مرحوم جامعہ کو دہلی اٹھالائے تھے، اور اپنی اس "بڑھاپے کی اولاد" کو اپنے بچے کھچے خونِ جگر کے سہارے زندہ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے حکیم صاحب مرحوم کو نہیں دیکھا ہے، لیکن میں نے ان کی متانت، شرافت، رواداری وفیاضی، ایثار و قربانی اور خاموش خدمتِ قومی کے واقعات بزرگوں سے

سُنے ہیں، اُن کی تصویر دیکھی ہے جس میں چہرے پر ایک ابدی، پُرسکون، خنک خنک معصوم مسکراہٹ اپنی تمام دلآویزیوں کے ساتھ من کو موہ لیتی ہے۔ میں جب کبھی ذاکر صاحب کو دیکھتا تھا، حکیم صاحب کی تصویر کی معصوم و دلآویز مسکراہٹ مجھے یاد آجاتی تھی، یقیناً، ذاکر صاحب اُن تمام تہذیبی قدروں کے حامل تھے جن کے ترجمان کا زندہ پیکر انھوں نے اپنے شباب کے دور میں حکیم صاحب مرحوم و مغفور کی صورت میں دیکھا تھا۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۸ء تک ذاکر صاحب جامعہ میں رہے، ۲۲ سال کا یہ عرصہ انھوں نے اور اُن کی قیادت میں ان کے ساتھیوں نے کس طرح گذارا، یہ داستان بڑی ولولہ انگیز ہے، یہ داستان رزم بھی ہے اور داستان بزم بھی۔ اسی میں ذاکر صاحب کے فکر و عمل کی وہ توانائیاں ملتی ہیں، اُن کے ایمان و یقین کی وہ معجز نمائیاں دیکھنے میں آتی ہیں، جنھوں نے انھیں ہماری انجمن کا وہ چراغ بنادیا کہ آج جب وہ چراغ بجھ گیا ہے تو روشنی بہت گھٹ گئی ہے۔ اس داستان کا ایک ورق خود ذاکر صاحب کی زبان میں سنیے:

"اُن گذرے ہوئے پچیس سال کی روئداد کس اسلوب سے پیش کروں۔ اس مدت میں عزائم اور فسخ عزائم، ولولوں اور پژمردگیوں، مشقتوں اور سہل انگاریوں، دلبستگیوں اور شکستگیوں، شبہوں اور اعتمادوں، امیدوں اور مایوسیوں، تھپکیوں اور گھڑکیوں، حوصلہ مندیوں اور درماندگیوں کی کیسی کیسی مثالیں سامنے آئی ہیں؟ اور یہ سب لفظ جو میں نے بولے یہ صرف برائے گفتن نہیں، اِن میں سے سب کی مثالیں اِس وقت میرے ذہن میں موجود ہیں، اس روئداد میں ان کا ذکر کروں تو داستان بہت طویل ہو جائے گی۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اگر خدمت قومی کا کوئی کام نیک نیتی سے خدا کا کام سمجھ کر کیا جائے تو ہر چند کہ دشواریوں اور آزمائشوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن جس کا کام ہوتا ہے وہ دست گیری فرماتا ہے، متزلزل قدموں کو ثبات عطا ہوتا ہے، دل توڑا بھی جاتا ہے مگر پھر جوڑا بھی جاتا ہے:

دلِ شکستہ در آں کوئے می کنند درست

چناں کہ خود نہ شناسی کہ از کجا بشکست

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۔ شرط یہ ہے کہ عسر کو اس کی رضاجوئی میں جھیلا جائے اور یسر کو اس کی راہ میں پیش قدمی کے لئے سہولت اور مرحمت جانا جائے۔"

(جامعہ کے پچیس سال، ۱۹۴۶ء)

۱۹۴۸ء میں جب حالات بدل گئے تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خطرات کے نرغے میں تھی، ذاکر صاحب پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے اصرار پر علی گڑھ گئے، ایک وہ وقت تھا کہ علی گڑھ سے سنگینوں کے سایے میں نکلے تھے، اور ایک وہ وقت آیا کہ علی گڑھ کو بچانے کے لئے پہونچے، ہم جو محراب و منبر پر چمکنے والے واعظوں، پبلک جلسوں میں جذبات بھڑکانے والے مقرروں اور اخبار و جرائد کے ذریعہ اپنی اہلیت کا پرچار کرنے والے صحافیوں ہی کو ملک و ملت کا خادم اور قومی رہنما تصور کرتے ہیں، کیا جانیں کہ خدمت قومی کے کتنے گوشے ہیں جہاں نمود و نمائش کا گذر نہیں، جہاں خاموش خدمت اور ان تھک کام ہی آپ اپنا انعام ہے، علی گڑھ میں ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے دور کی صحیح تاریخ جب مرتب ہوگی تو اندازہ ہوگا کہ علی گڑھ کے اس اولڈ بوائے نے ملت اسلامیہ ہند کے اس تعلیمی مرکز کے لئے کیا کیا، علی گڑھ کے بعد وہ بہار کے گورنر ہوئے، پھر جمہوریۂ ہند کے نائب صدر اور آخر میں تقریباً دو سال وہ ہندوستان کے صدر رہے، عام طور پر مسلمانوں نے ذاکر صاحب کے صدر بننے کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا، بالکل اسی طرح جیسے وہ مولانا آزاد کے وزیر تعلیم بننے اور وزراء کی کونسل میں کیبنٹ منسٹر رہنے کی اہمیت سے ناواقف تھے۔ ہماری یہ خصوصیت ہے کہ ہم اپنے محسنوں کو اُن کی زندگی میں نہیں پہچانتے، ہاں جب وہ اس دنیا میں نہیں رہتے تب ہمیں اُن کی قدر و منزلت کا احساس ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب سچے مسلمان تھے، ذاکر صاحب سچے ہندوستانی تھے، ذاکر صاحب ہونے کے لیے

ہندستانی شہری تھے جیسے ہندستانی شہری بنانے کے لئے انھوں نے جامعہ کی تعمیر میں اپنی زندگی کا بہترین حصہ صرف کیا، ذاکر صاحب سچے مسلمان اور سچے ہندستانی اس لئے بھی تھے کہ ان کے دل میں بلا لحاظ ملک وملت سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ تھا۔ ایسا بارہا ہوا ہے کہ رحمتِ الٰہی برگزیدہ بندوں کے قلب کا گداز بن کر انسانوں کی دنیا میں اتر آئی اور سب کے زخموں کا مرہم بن گئی ہے، ذاکر صاحب کی سیرت وشخصیت میں صوفیوں کے دل کے سوز و گداز کا بھی ایک حصہ تھا، اس میں خدا ترسی کے سبب خاشعین و مستغفرین بالاسحار کی فغان نیم شبی اور آہِ سحرگاہی کی چنگاریاں بھی شامل ہوگئی تھیں، اسی لئے وہ سب سے اس طرح ملتے تھے کہ اپنی بڑائی کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے آپ کو انسانوں سے الگ نہیں رکھا، بعض لوگ اسے قدیم مشرقی تہذیب و شرافت کا نمونہ کہیں گے، بعضوں کے نزدیک یہ وضعداری ٹھہرے گی، میرا خیال ہے کہ یہ کوئی اور چیز تھی جو ان چیزوں سے بالاتر ہے۔

ذاکر صاحب کے علمی کمالات سے دنیا واقف ہے، علم، ادب اور فن کی قدر دانی انھوں نے جس طرح کی، وہ صاحب طرز انشاپرداز اور شعلہ نوا مقرر بھی تھے، فن گفتگو میں اُن کی مثال مشکل ہی سے ملتی تھی، قدرت نے انھیں ایک نکتہ رس ذہن عطا کیا تھا، خاندانی شرافت اور شخصی وجاہت بھی انھیں ورثہ میں ملی تھی، چاہتے تو بہت بڑے سیاسی رہنما بن جاتے لیکن انھوں نے تعلیم کا صبر آزما کام منتخب کیا کہ یہی وہ پیغمبرانہ کام ہے جس کی برکتیں جاری رہتی ہیں اور اس چشمۂ فیض سے ایک دو نسل نہیں نسلیں سیراب ہوتی ہیں، یہ پیغمبرانہ کام اس لئے بھی ہے کہ اس کے لئے سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں، گھوم گھوم کر بازاروں اور مجمعوں میں تعلیم کی افادیت بتانی ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب نے تعلیم کی خاطر کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی، کس کس کے در پر نہیں گئے، غریبوں کی بستیوں میں بھی آواز لگائی اور امیروں کے دروازوں کو بھی کھٹکھٹایا، لیکن کہیں سر نہیں جھکایا، کسی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، علم کی خودداری کا عَلَم ان کے ہاتھ سے نہ حیدرآباد میں چھوٹا نہ رام پور میں، زندگی ہو تو ایسی اور کام ہو تو ایسا۔

زندگی وہی بسر کرنے کے قابل ہے کہ آدمی دوسروں کی کمزوریاں تلاش کرنے کے بجائے، خود اپنا جائزہ لیتا رہے، اپنے آپ کو جانچنے کی رسم عام نہیں، کتنے لوگ ایسے ہیں جو خود اپنی کمین میں بیٹھیں اور اپنے نفس کو اپنا ہدف بنائیں، ذاکر صاحب ایک ایسے علم تھے جو اپنے شاگردوں اور ساتھیوں کے کام کے ساتھ اپنے اعمال کا جائزہ لینے میں بڑی سختی سے کام لیتے تھے، اُن کی طبیعت کی افتاد ہی ایسی تھی، اور یہ بات آخر تک باقی رہی، دلّو باجی کی کتاب "روح القرآن" جب چھپ رہی تھی تو اُن کے ساتھیوں نے جناب آحد فاطمی کے ذریعہ ذاکر صاحب سے استدعا کی کہ وہ اس پر مقدمہ یا پیش لفظ لکھدیں، ذاکر صاحب نے فاطمی صاحب کو لکھا: مکرمی جناب فاطمی صاحب! السلام علیکم دونوں نوازش نامے ملے، یاد فرمائی کا شکریہ اور ناخیر جواب کی معذرت قبول فرمائیے۔ میں نے دلّو باجی کا انتخاب قرآن مجید غور سے دیکھا، بہت اچھا ہے ... مقدمہ یا پیش لفظ لکھنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ نہ بن سکا، رہ رہ کر یہ خیال کر تعلیمات قرآنی کی تعمیل میں کیا کیا کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہوتی ہیں اور اپنی زندگی اس نقشے سے کتنی دور ہے، جو قرآن چاہتا ہے، کچھ لکھنے کی ہمت نہیں کرنے دیتا۔ کسی دوسرے کو اپنی اس کیفیت کا سمجھانا دشوار ہے، مگر یقین فرمائیے کہ سچ ہے، اور باوجود کوشش کے اس نے کچھ نہ لکھنے دیا، امید ہے کہ آپ میری مجبوری کو سمجھ سکیں گے اور مجھے معاف فرمادیں گے، اگر بات دلّو باجی تک پہنچ چکی ہے تو ان سے بھی معافی منگا دیں گے...... مخلص، ذاکر حسین۔" اس خط میں عرق انفعال کے جو قطرے ہیں، کیا عجب کہ شان کریمی انھیں موتی قرار دے کر چُن لے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے، انھیں اپنے محبوب بندوں کی صف میں جگہ دے اور ان کے متعلقین اور ہم جامعہ والوں کو صبر جمیل کی طاقت عطا فرمائے، دعا ہے کہ ہماری قوم کے نوجوانوں کو قومی خدمت کا ولولہ اور ایثار و قربانی کا جذبہ عطا ہو کہ یہ وہ دل کی دولت ہے جو ہاتھ سے کبھی نہیں جاتی اور دنیا و آخرت میں کامیابی اور سُرخروئی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ آمین، ثم آمین۔

پروفیسر محمد مجیب

ذاکر صاحب

دوستو اور ساتھیو،

آج بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں، ۲۴ء کی وہ گفتگو جب میں نے ذاکر صاحب سے کہا تھا کہ میں بھی جامعہ میں کام کرنا چاہتا ہوں اور انھوں نے گھبرا کر جواب دیا تھا کہ آپ کے لئے جامعہ میں کام کرنا مناسب نہ ہوگا، مگر میری ضد دیکھ کر مجھے اپنے ساتھ شریک کرنے پر راضی ہو گئے تھے، وہ شروع کے پانچ چھ سال جب میں جامعہ میں تھا اور نہیں بھی تھا جب ذاکر صاحب کی مشکلوں اور پریشانیوں کو دل پر اثر لئے بغیر دیکھتا تھا، کاموں میں حصہ لیتا تھا مگر مجبوری سمجھ کر، اور جامعہ کے حال اور مستقبل کے بارے میں سنی سنائی باتیں تحریروں اور تقریروں میں دہراتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود یہ کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ ذاکر صاحب سے الگ ہو کر بھی زندگی گذاری جا سکتی ہے۔ اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ اس کا اصل سبب میری نااہلی اور پست ہمتی تھی، اور اس بنانے والے کی ہمت اور صبر پر حیرت کرتا ہوں جس نے ایسے ناقص آب و گل کے مجموعے کو انسان کی شکل دینا اپنی کارگذاری میں شامل کر لیا۔ پھر وہ زمانہ آیا جب اپنی بے تعلقی پر شرم آنے لگی، اور میں نے دفتری کاموں میں شرکت کی اجازت چاہی۔ اس وقت سے میری تربیت شروع ہوئی۔ مگر استاد اپنے فن میں ایسا کامل تھا کہ کبھی سامنے نہ آتا، ضمیر کی آواز بن کر ہدایت دیتا، غلطیوں اور کوتاہیوں پر کبھی ملامت نہ کرتا، اور جب کبھی اندیشہ ہوتا کہ کامیابی اطمینان یا غرور پیدا کرے گی تو کہہ دیتا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، ہمارے حوصلے اور آرزوئیں

سب ہیچ ہیں، مقصد صرف یہ ہے کہ زندگی کسی کارآمد طریقے سے گذار دی جائے۔ مگر اس بات کی تردید بھی بہت جلد ہو جاتی جب کسی دعوت یا تقریب یا تعلیمی منصوبے کا کام اس طرح کیا جاتا کہ گویا اس میں کوئی عیب رہ گیا تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جامعہ کے ابتدائی دور کی دشواریاں، آدمیوں کی، صلاحیتوں کی، وسائل کی کمی، طبیعتوں کا اختلاف، یاس مشربی کا میلان، اعتراض کا شوق یاد آتا ہے تو یقین نہیں آتا کہ کسی کے کندھوں میں اتنی طاقت کسی کے مزاج میں نرمی اور گرمی ایسی آمیزش، شوق اور حقیقت شناسی کے ایسے رنگ، آدمی اور موقع کی ایسی پہچان ہو سکتی ہے کہ ایسے بوجھ کو اٹھائے۔ ذاکر صاحب نے یہ بوجھ اٹھایا، اور اس خوبی سے کہ وہ ان کی شخصیت کا عکس بن گیا۔ یاد آتا ہے کہ ہم ان کی طرف کیسے دیکھتے، ان کی باتوں کو کیسے سنتے، ان کے اشاروں پر کیسے چلتے تھے۔ ہم نے کبھی یہ نہ سوچا کہ وہ بھی آدمی ہیں، تھکتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں، غم یا غصہ محسوس کرتے ہیں۔ اور وہ تھے کہ ہمارے مطالبوں کو، ہمارے اعتراضوں اور شکایتوں کو بھی کم سمجھتے تھے، جامعہ اور جامعہ میں کام کرنے والے، جامعہ کا حال اور مستقبل ان کے لئے ہمت اور توفیق کا ایک مسلسل امتحان تھا، اور وہ ناداری اور بے بسی کے عالم میں اس بندۂ مومن کی جیتی جاگتی مثال تھے جس کے بارے میں ڈاکٹر اقبال نے لکھا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام، وہم، طلسم و مجاز

ایسے بندۂ مومن اور مرد خدا کا ساتھ بھی ایک مسلسل امتحان ہو جاتا ہے، سب سے بڑا خطرہ اس کا ہوتا ہے کہ ساتھی اس مغالطے میں پڑ جائے گا کہ اس میں بھی مومن اور مرد خدا کی صفتیں ہیں، جیسے کسی زمانے میں صاحب کا چپراسی اپنے آپ کو صاحب سمجھنے لگتا تھا۔ اس خطرے سے مجھے اس خوف نے بچا لیا جو گھر پر آرام سے بیٹھنے والوں کو سفر کی زحمتیں اٹھانے سے روکتا ہے۔ قاعدے کا سہارا لے کر چلنے والی کمزور طبیعت اس آزادی سے گھبراتی ہے جو قاعدوں سے اوپر اٹھ کر نئی انسانیت اور نئی زندگی کے خاکے بناتی ہے، رد کرتی ہے اور پھر بناتی ہے۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ذاکر صاحب کی گفتگو کے بہتے چشموں اور باغ و بہار وادیوں کا لطف اٹھاتے تھے، کہ میرا حوصلہ دو چار کیاریوں اور دو چار پھولوں سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس سے بھی مجھے اپنا صحیح مقام معلوم کرنے میں مدد ملی، اور میں جب ضرورت ہوتی تو سامنے آتا، نہیں تو جو کام میرے سپرد تھے ان میں لگا رہتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ قرب کے ساتھ یہ دوری ذاکر صاحب کو پسند تھی یا نہیں، لیکن اس کی شکایت وہ کیا کرتے تھے، اگرچہ وہ جانتے تھے کہ میں نے اپنا طریقہ طبیعت کی سستی کی وجہ سے اختیار کیا ہے اور اسے بدل نہیں سکتا۔ ایک دفعہ جب وہ علاج کے لیے جرمنی گئے ہوئے تھے اور میں ان کی جگہ کام کر رہا تھا انھوں نے خط میں یہ شعر لکھ دیا:

ہمچو رندے کہ بہ مستی دل آید بسرو   در بہاراں ہمہ بوییت ز صبا می آید

کوئی پچیس برس بعد جب وہ وائس پریزیڈنٹ تھے میں ان سے ملنے گیا اور دستور کے مطابق وہ مجھے برساتی تک رخصت کرنے آئے۔ برساتی پھولوں اور پودوں سے سجی ہوئی تھی۔ میں نے پھولوں کی تعریف کی تو جواب میں کندھے پر ہاتھ رکھ کر غالب کا یہ شعر سنایا:

ہجوم گل بہ بہاراں ہلاک شوقم کرد   کہ جا نماندہ وجائے تو ہمچناں خالیست

یہ عنایت کچھ میرے ہی اوپر نہیں تھی۔ کاٹھ منڈو میں ان کے ایک دوست جو انھیں بہت عزیز تھے اور کئی سال تک ان سے نہیں ملے تھے رو رو کر ایک خط کا ذکر کر رہے تھے جس میں ذاکر صاحب نے انھیں لکھا تھا:

یادم نمی کنی و زیادم نمی روی   عمرت دراز باد فراموش کار من

اور ہم دونوں کے علاوہ نہ معلوم کتنے لوگ ہوں گے جن کی عمر بھر کی خوشی اور تسلی کا سامان ذاکر صاحب نے ایک دو شعر لکھ کر کیا ہوگا۔

ذاکر صاحب کو میری طرف سے بڑی مایوسی ہوئی ہوگی کہ میں ان کے تعلیمی منصوبوں میں جیسا کہ چاہیے تھا شریک نہ ہو سکا، اور ضد کرتا رہا کہ میرا مضمون کچھ اور ہے۔ ہم وردھا کی تاریخی کانفرنس میں

جہاں گاندھی جی نے حرفے کے ذریعے تعلیم کا خیال پیش کیا شرکت کے لئے جا رہے تھے تو راستے میں انھوں نے پوچھا کہ بتائیے ہمیں کانفرنس میں کیا کہنا چاہیئے میرا ذہن بالکل خالی تھا، اور میں نے کہا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو وہ چپ ہو گئے۔ تعلیم ان کا اپنا مضمون بھی نہیں تھا، دراصل وہ معاشیات کے عالم تھے، لیکن ان کی ذہانت ایسی تھی کہ وہ شوق پر کسی طرح کی پابندی لگا ہی نہیں سکتے تھے۔ جرمنی کے قیام کے دوران میں جیسے انھوں نے دیوان غالب کا بے مثل اڈیشن خود پریس میں کام کر کے تیار کیا اور گاندھی جی پر ایک کتاب جرمن زبان میں کچھ لکھی کچھ لکھوائی، ویسے ہی انھوں نے خاصا وقت تعلیم کے فلسفہ اور فن پر کتابیں پڑھنے میں صرف کیا اور کئی ایسے اداروں کا مشاہدہ کیا جہاں نئے تعلیمی تجربے کئے جا رہے تھے۔ ۲۶ء میں وہ جامعہ انھیں سب معلومات سے متاثر ہو کر آئے، مکتبہ جامعہ کو بچوں کی کتابوں کا ایک ممتاز مرکز بنایا، اور ان کی رہنمائی میں عبدالغفار مدھولوی صاحب نے مدرسہ ابتدائی کو ایک نمونہ کا مدرسہ بنایا۔ مجھے جامعہ کے تعلیمی کام کی نوعیت اور معیار کا اندازہ اس وقت ہوا جب نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے چند ماہروں نے جو دنیا کا دورہ کر رہے تھے مجھ سے کہا اور جب میں نے ظاہر کیا کہ ان کی رائے بہت مبالغہ آمیز ہے تو مجھے لکھ کر دیدیا کہ ہم نے اس سے بہتر کوئی اور مدرسہ نہیں دیکھا ہے۔ یہی لگ بھگ وہ زمانہ تھا جب بنیادی قومی تعلیم کی تحریک شروع ہوئی، اور ذاکر صاحب کا سارا وقت اور ساری قوت اسی کی نذر ہو گئی۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو بنیادی قومی تعلیم کو ذاکر صاحب کی بدولت اور ذاکر صاحب کو بنیادی قومی تعلیم کی بدولت بہت فائدہ پہنچا، کہ اس کے بعد وہ ملک کے سب سے ممتاز ماہر تعلیم اور گاندھی جی کے خاص چیلوں میں شمار ہونے لگے۔ لیکن بنیادی قومی تعلیم کے اصولوں کو اس طرح برتا گیا کہ وہ تعلیم کے اس تصور سے دور ہوتی گئی جو ذاکر صاحب کے اپنے ذہن میں تھا، اور رفتہ رفتہ وہ اس سے الگ ہوتے گئے۔ وہ زمانہ جب ملک کی تقسیم کے چرچے ہو رہے تھے بڑے پیمانے پر تعلیمی تجربوں کے لئے موزوں تھا بھی نہیں، کہ ہر خیال کو سیاسی رنگ دیا جاتا تھا اور یہ رنگ یا تو لیگی ہو سکتا تھا یا کانگریسی۔ یہ ذاکر صاحب کی شخصیت کا

لال تھا کہ بنیادی تعلیم کی روح رواں ہوتے ہوئے بھی سیاسی عداوتوں کی لپیٹ میں نہیں آئے۔

ذاکر صاحب وہ برگزیدہ مسافر تھے کہ جس رستے پر چلتے وہ انھیں کامیابی کی آخری منزل تک پہنچا دیتا۔ ان میں وہ تمام صفتیں تھیں جو ایک مدبر اور قومی رہنما میں ہونی چاہئیں، لیکن شاید ان کا فیصلہ نہیں بلکہ خدا کی مرضی یہ تھی کہ وہ تعلیم کو اپنا میدان عمل بنائیں۔ اس میدان میں بھی موثر وہی ہو سکتا ہے جس کے مزاج اور سرشت میں سیاست کی اعلیٰ قدریں شامل ہوں، جو صرف بچوں اور نوجوانوں کی نہیں بلکہ عام انسانوں کی فطرت سمجھتا ہو، جو موقع شناس اور مردم شناس ہو، جو دوسروں میں خود اعتمادی پیدا کر سکے اور اپنے کام اس طرح کرائے کہ کام کرنے والے انھیں اپنے سوچے ہوئے کام سمجھیں۔ جامعہ مشکلوں کے ہجوم میں کھو جاتی اگر ذاکر صاحب کی طبیعت میں وہ کارسازی، مصلحت، دوراندیشی اور صبر نہ ہوتا جو اعلیٰ سیاست کی قدریں ہیں۔ انھوں نے جامعہ والوں کو خیال اور گفتگو کی پوری آزادی دی، اختلاف کے لئے ہر ممکن گنجائش رکھ کر ان میں وفاداری اور یک جہتی قائم رکھی، اور جوبلی کے موقع پر ان کی اس انداز سے تعریف کی کہ سننے والوں کو یقین ہو گیا کہ جو شیشے کے ٹکڑے سمجھے جاتے تھے وہ دراصل ہیرے ہیں، اور ان کا اوکھلا کے غیر آباد علاقے میں رہنا انھیں مستحق کر دیتا ہے کہ غالب کی طرح وہ کہہ سکیں:

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل　　　قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

یہ بھی سیاسی توفیق کا ایک کرشمہ تھا کہ ذاکر صاحب نے جامعہ کی پچیس سالہ جوبلی کو قومی اتحاد کا ایک مظاہرہ بنانے کا ارادہ کیا، وہ سلیقہ کسی معلم میں نہیں بلکہ مدبر ہی میں ہو سکتا ہے جس سے انھوں نے کانگریس اور لیگ کے لیڈروں کو ایک جگہ جمع کر کے ان سے جامعہ کی قومی اہمیت کا اعتراف کرایا۔

جامعہ کے پہلے استاد اور طالب علم مسلم یونیورسٹی کو چھوڑ کر آئے تھے اور ان میں مذہبی جوش بہت تھا۔ اس میں شدت بہت تھی اور تعصب تھا تو بہت کم۔ ۲۶ء سے، جب جامعہ ملیہ کو زندہ رکھنے کے لئے قوم سے چندہ مانگنے کے سوا کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اسلام کا حوالہ

اکثر دیا جاتا۔ مسلمان ماں باپ اپنے بچوں کو جامعہ اس لئے بھیجتے تھے کہ یہاں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی، سیاسی حالات ناموافق نہ ہوتے، اور لوگ جامعہ کے تعلیمی اصولوں کا اعتبار کرتے تو ہندو اور سکھ اور عیسائی ماں باپ بھی اپنے بچوں کو جامعہ اس خیال سے بھیجتے کہ یہاں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ سیاسی مخالفتوں کی وجہ سے جامعہ کو یہ شرف حاصل نہ ہو سکا کہ ہر مذہب کے بچوں کو ان کے دین کی تعلیم دے۔ اور آزادی کے بعد، جب اس کا امکان پیدا ہوا تو مدرسوں میں مذہبی تعلیم لازمی کرنے پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ مجھے خود سہارے کی تلاش تھی، اس لئے میں دینی معاملات میں ذاکر صاحب کے قول اور عمل کو دیکھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ پابندی سے تلاوت کرتے ہیں، کبھی کبھی انھوں نے مجھے کسی آیت کے معنی اس طرح سمجھائے جیسے کہ قرآن کا کوئی سچا عالم ہی سمجھا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے وہ آیت یاد آتی ہے جس میں ایمان والوں کی تعریف کی گئی ہے، اور آخر میں یعنی سب سے اونچے مقام پر ان لوگوں کو رکھا گیا ہے جو رات کو اٹھ کر روتے ہیں۔ بیشتر ذاکر صاحب میرے سوالوں کا جواب نہ دیتے یا کسی صوفی کا کوئی قصہ سنا دیتے جو میرے سوال کا جواب سمجھا جا سکتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مرید کا قصہ سنایا جس کی موجودگی میں اس کے پیر نے کسی درخت کے بارے میں کہا کہ اس کی مسواک بہت اچھی ہوتی ہے۔ مرید نے اس قسم کے درخت کی تلاش شروع کی۔ معلوم ہوا کہ پانچ چھ میل پر ایسا ایک درخت ہے۔ وہ رات کو دو تین بجے اٹھ کر جاتا اور روز اپنے پیر کے لئے ایک تازہ مسواک کاٹ کر لے آتا۔ یہ وہ برسوں تک کرتا رہا اور پیر کو خبر نہ ہوئی۔ فرخ آباد کے کسی صوفی کے پٹھان مرید کا قصہ انھوں نے کئی بار سنایا جو ہر موقع پر اپنے پیر سے ہندوؤں اور ہندو دھرم کی برائی کرتا تھا۔ پیر کے سمجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو انھوں نے مرید کو حکم دیا کہ دھوتی باندھو، ٹیکا لگاؤ، چٹیا بڑھاؤ اور ہندوؤں کے جتنے تیرتھ ہیں ان کی یاترا کرو تب تمھارا ایمان درست ہوگا۔

مجھے معلوم نہیں کہ ذاکر صاحب نے دوسرے مذہبوں کا کتنا مطالعہ کیا اور کب کیا۔ ان کا دل دینی اور اخلاقی قدروں سے کس قدر متاثر ہوتا تھا یہ ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں

نے خود مجھ سے بیان کیا۔ کہنے لگے میں گورو گووند سنگھ پر تقریر لکھ رہا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ کاغذ پر قطرے ٹپکنے لگے، پھر احساس ہوا کہ یہ میری آنکھوں سے ٹپک رہے ہیں۔ خیر، جیسے تیسے تقریر ختم کی۔ پھر جب پنجاب یونیورسٹی میں تقریر کر رہا تھا تو اسی موقع پر آکر میرے آنسو بہنے لگے۔ مجھے کچھ شرمندگی ہوئی کہ بھری محفل میں اس طرح رو رہا ہوں، لیکن جب ادھر اُدھر دیکھا تو دھرم ویر صاحب گورنر پنجاب اور بہت سے حضرات کے میری طرح آنسو بہ رہے تھے۔

لیکن مجھ پر ان سب باتوں سے کہیں زیادہ اثر ذاکر صاحب کے اپنے عمل کا ہوا۔ وہ مذہبی مسائل پر بڑی آزادی سے گفتگو کرتے تھے، اور رفتہ رفتہ میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ ان کا اصل منشا اپنے نفس کو اس گھمنڈ سے پاک رکھنا ہے جو نیک عمل کا ایک نتیجہ ہو سکتا ہے۔ ان کے دل میں خدا کا وہ خوف تھا جو واردات قلبی سے پیدا ہوتا ہے، اور یہ خوف ان کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھا۔ اپنی زبان سے شاید ہی کبھی انھوں نے اس سلسلے میں کچھ کہا ہو، میرے لئے اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ دوسرے کا دل دُکھانے سے بہت ڈرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ قرول باغ میں جب ہم سب بڑی بے سروسامانی سے رہتے تھے تو انھوں نے اپنے لئے ایک پلنگ، کچھ مونڈھے اور کچھ کرسیاں خریدی تھیں۔ جامعہ کے استادوں میں سے ایک کے والد، جو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب انھیں بہت عزیز رکھتے ہیں، ان کے مونڈھے ایک ایک کرکے مانگ لے گئے، تاکہ وہ لوگوں سے کہہ سکیں کہ ذاکر صاحب نے انھیں یہ تحفے کے طور پر دئے ہیں۔ مونڈھے نہیں رہے تو کرسیوں کی باری آئی۔ میں قریب ہی ایک کمرہ میں رہتا تھا، اور جب وہ کرسیاں اٹھانے کے لئے ایک مزدور کو لے کر آئے تو مجھ سے نہ رہا گیا، اور میں نے ان سے خاصے سخت لہجے میں پوچھا کہ کیا آپ ذاکر صاحب کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑیں گے۔ وہ چلے گئے اور ادھر میں نے ذاکر صاحب کو دیکھا تو ان کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ مگر انھیں میرا دل بھی دُکھانا منظور نہ تھا۔ یہ کہہ کر رہ گئے کہ "ارے مجیب صاحب، یہ آپ نے کیا کر دیا!" اسی کے چند سال بعد کا واقعہ ہے کہ ان کی آنکھوں میں سخت تکلیف تھی،

اور ہم لوگوں نے انھیں ایک کمرہ میں دروازے بند کر کے لٹا دیا تھا۔ لوگ ان کے پاس مزاج پرسی کے لئے یا کسی کام سے آتے تو ہم ان کو اندر نہ جانے دیتے۔ اتفاق سے اسی وقت ایک صاحب آئے جنھیں ہم نہیں پہچانتے تھے اور ذاکر صاحب سے ملنے کی خواہش کی۔ ہم نے کہا کہ اس وقت انھیں بہت تکلیف ہے، ان سے آپ نہیں مل سکتے۔ لیکن وہ ایک فرمائشی غرض کے بندے تھے، اڑ گئے، کہنے لگے کہ میں پنجاب سے آیا ہوں، مجھے ضرور ان سے ملاقات کرنی ہے۔ بحث میں سب کی آواز ذرا اونچی ہو گئی، یہاں تک کہ ذاکر صاحب کو معلوم ہو گیا کہ ایک صاحب آئے ہیں اور ان سے ملنے پر مصر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انھیں اندر بھیج دیجئے، اور ہم نے تامل کیا اور انھیں سمجھانے کی کوشش کی تو بہت بے چین ہو گئے۔ آخر میں ہم نے ہار مان لی اور پنجاب سے آئے ہوئے غرضمند کو یہ درخواست کر کے کہ زیادہ دیر نہ بیٹھئے گا، اندر بلا لیا۔ ایک مرتبہ گرڈا فلپس بورن نے، جو جرمنی سے جامعہ کی خدمت کرنے آئی تھیں بڑے شوق سے ذاکر صاحب کے لئے کلیجی پکائی تھی۔ ایک وقت وہ نہیں آ سکے تو مس فلپس بورن نے اسے دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، کلیجی خراب گئی۔ ذاکر صاحب حامد علی صاحب کے ساتھ کھانے کے لئے آئے تو انھوں نے فوراً محسوس کیا کہ کلیجی خراب گئی ہے، لیکن اس کے سوا کھانے کو کچھ تھا نہیں اور وہ بھوکے رہتے تو مس فلپس بورن کو بڑی ندامت ہوتی۔ انھوں نے حامد صاحب کو اشارے سے منع کیا کہ تم اسے مت کھاؤ اور خود اس کے مزے کی تعریف کرتے ہوئے سب کھا گئے۔

کسی کام کو پورے انہاک سے کرنا اور اپنے اوپر یہ پابندی لگانا کہ کسی کا دل نہ دکھے ایسا مطالبہ ہے جسے ہمت والا ہی پورا کر سکتا ہے۔ ہم جامعہ والے ذاکر صاحب پر، خاص طور سے اس زمانے میں جب حالات بہت خراب تھے، اکثر نکتہ چینی کرتے تھے۔ یہ شکایت ہمیں رہتی تھی کہ انھوں نے ہماری رائے نہیں مانی، یہ شکایت کبھی نہیں ہوئی کہ انھوں نے کسی کا دل دکھایا۔ جیسے جیسے ان کا اثر بڑھا، اور ان لوگوں کی تعداد بڑھی جو اس اثر سے فائدہ اٹھانا چاہتے

تھے ویسے ہی شکایت کرنے والوں کی شکایتیں بھی بڑھیں، اور اس کے ساتھ ان لوگوں کی تعداد بھی جو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے کسی مناسب شخص کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ذاکر صاحب کا منصب یہ تھا کہ جدید طرز پر سوچنے اور عمل کرنے کے ساتھ پرانے صوفیوں کے طریقے پر ہر دکھی کو اپنا دکھ بیان کرنے کا موقع دیں، اور یہ کام اتنا ناگوار اور بظاہر عقل کے خلاف ہے کہ اسے وہی انجام دے سکتا ہے جسے بے پناہ صبر، بندوں کی محبت اور خدا کے خوف سے لبریز دل عطا کیا گیا ہو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ذاکر صاحب گورنر ہوئے، نائب صدر ہوئے، پھر صدر جمہوریہ ہوئے، یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس اعزاز کے ساتھ کتنے لوگوں کے غم کو انھیں اپنا غم بنانا پڑا۔

ذاکر صاحب تہذیب کا ایک مثالی نمونہ تھے۔ اس نمونے کا تجزیہ کیجئے تو اس کا ایک حصہ وہ ورثہ ہوگا جو مولانا روم سے لے کر ڈاکٹر اقبال تک شاعروں کے کلام میں پہنچا ہے۔ دوسرا وہ جس کی مثال حکیم اجمل خاں تھے اور تیسرا خود ان کا مزاج۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ شاعروں میں سے کون یا کوئی بھی خاص طور پر ان کا محبوب تھا، ان کی بیاض میں شاید غالب کا کلام زیادہ ہے، لیکن انھوں نے جوانی میں انتخاب کیا ہوتا تو غالباً مولانا روم اور اقبال کا کلام زیادہ ہوتا۔ بہرحال، ان کی طبیعت کو سود و زیاں، فائدے اور نقصان کی قید سے آزاد عشق نے کیا، اور یہ ان کی شخصیت کے خمیر میں اس طرح شامل ہو گیا کہ ان میں اس عاشق کی صفات پیدا ہو گئیں جو تصوف کا نصب العین ہے۔ حکیم اجمل خاں کا اور ان کا کچھ کم دو برس ساتھ رہا، مگر مجھے معلوم ہے کہ ایک کا دوسرے پر بہت اثر پڑا، اور اس سے وہ تہذیبی میلانات جو ذاکر صاحب میں پہلے سے موجود تھے تقویت پا گئے۔ ان کے اپنے مزاج کو مستقل شکل دینے میں ان کے جرمنی کے قیام کو بہت دخل ہے کہ یہاں انھیں علم اور تعلیم کے علاوہ فنون لطیفہ سے دلچسپی ہو گئی، اور جب وہ رفتہ رفتہ منظر عام پر آئے تو ان کی ہمدردی اور قدرشناسی نے ہر علم اور فن کے جاننے والے کو متاثر کیا، یہاں تک کہ جو مصور تصویر بناتا، جو باغبان باغ لگاتا، وہ ان کے پاس قدردانی اور ہمت افزائی کی اتنی ہی امیدیں لے کر جاتا جیسے کہ کوئی عالم یا ماہر تعلیم۔

ذاکر صاحب کی تعریف کرنے والے اور میری طرح اپنے آپ کو ان کا دوست سمجھنے والے بے حساب ہوں گے، لیکن ان کی اصل ساتھی، جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں اور شاید کسی حال میں بھی اپنی زبان سے اس بارے میں کچھ نہ کہیں گی، ان کی بیٹیوں سعیدہ اور صفیہ کی ماں ہیں۔

ہم سب نے ذاکر صاحب کو اچھا کھاتے، اچھا پہنتے دیکھا ہے، ان کی صحبت کا لطف اٹھایا ہے، ان سے معاملات پر گفتگو کی ہے۔ ہم میں سے کسی کو سترہ اٹھارہ برس کیا ایک دن بھی یہ سوچنے کی ضرورت نہ ہوئی کہ تنخواہ کے پینتالیس روپے میں کیسے کام چلے گا، ہم میں سے کسی نے ذاکر صاحب کو دال روٹی اس وجہ سے نہیں کھلائی کہ تنخواہ میں اسی کی گنجائش تھی۔ ہم میں سے کسی نے اپنی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا کہ ذاکر صاحب کی ضرورت پوری ہو۔ تکلیف نہیں اٹھائی کہ ان کو آرام پہنچے۔ آج کے دن جب ہم ذاکر صاحب کے امتیاز اور سربلندی کی کیفیت بیان کر رہے ہیں اور اس کا شوق اور جوش کے ساتھ اعتراف کر رہے ہیں کہ انھوں نے ہم کو اور ساری ہندوستانی قوم کو گرویدہ کر لیا تو ہمیں ان کی رفیقۂ حیات کی اس محبت اور ایثار کو بھی یاد رکھنا چاہیے جس کے سامنے خود ان کا سر جھکا رہا جسے قدرت نے سرفرازی کے لئے بنایا تھا۔

جامعہ کے مسجل صاحب نے اور میں نے ذاکر صاحب سے بڑی مشکل سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ۱۰ ؍مئی کی شام کو یہاں آئیں گے۔ وہ آئے اور بہت پہلے سے آگئے، ہم کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کے لئے جسے ہم اپنے دھندوں میں بھول جاتے ہیں:

کل من علیہا فان و یبقٰی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام

دوخط

جناب عبدالغفار مدھولی صاحب ۱۹۲۳ء سے جامعہ میں ہیں، انھوں نے مدرسۂ ابتدائی میں بچوں کی تعلیم سے متعلق جو نت نئے تجربے کئے اور جنھیں بعد میں انھوں نے اپنی دو اہم کتابوں "ایک معلّم کی زندگی" اور "جامعہ کی کہانی" میں اپنے خاص انداز میں بیان کیا۔ ان کی وجہ سے ملک کے تعلیمی حلقوں میں استادوں کی خاصی بڑی تعداد اُن سے واقف ہے۔ موصوف کو ذاکر صاحب سے اور ذاکر صاحب کو اُن سے بڑا گہرا قلبی تعلق تھا۔ ۸ مئی کو انھوں نے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کو مندرجہ ذیل مکتوب لکھا۔

جناب خلیل شرف الدین صاحب جامعہ کے پُرانے طالب علم ہیں، بمبئی میں رہتے ہیں، اُن کا خط مرحوم ذاکر صاحب کی اچانک وفات پر جدّہ سے آیا جہاں وہ آج کل مقیم ہیں۔ مخاطب ان کے ایک عزیز دوست جناب محمد طیّب صاحب ہیں، طیّب صاحب جامعہ کے پُرانے طالب علم اور آج کل جامعہ میں اکاؤنٹس آفیسر ہیں۔ یہ دونوں خط ۱۰ مئی کو جامعہ کے تعزیتی جلسے میں پڑھ کر سنائے گئے۔

(۱)

مکرّمی ۔ السلام علیکم

قرآن خوانی کے بعد آپ سے چھپ کر میں برآمدہ میں بیٹھا تھا کہ آپ نے مجھے پکڑ ہی لیا۔ اس پر مجھے ڈاکٹر ذاکر صاحب کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ آج کل جس جگہ نوارہ بنا ہے، وہاں دو راستے ہیں۔ کوئی بات ایسی آپڑی تھی کہ میں ڈاکٹر صاحب سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سامنے سے آرہے

تھے میں جا رہا تھا۔ میں نے اپنی رفتار کم کردی کہ دیکھیں وہ کس راستے سے جاتے ہیں۔ جب وہ ایک طرف چلے گئے تو میں دوسری طرف سے آگے بڑھا اتنے میں ڈاکٹر صاحب نے راستہ پار کر کے مجھے پکڑ ہی لیا۔ اس موقع پر مجھے انگریزی کے ڈرامہ کا ایک فیچر یاد آرہا ہے جو بہت زمانہ ہوا آل انڈیا ریڈیو سے سنا تھا۔ اس میں ایک ماں اپنی بچی سے بہت محبت کرتی ہے اور بچی کے ساتھ "میرے آڑی گپ چھپ" کھیلتی بھی ہے۔ جب بچی کا انتقال ہو جاتا ہے اور تابوت میں آخری کیلیں جڑی جاتی ہیں تو ماں بھرّائی آواز میں کہتی ہے "کیا اس تابوت سے میرے آڑی گپ چھپ' کی آواز نہیں آئے گی ؟"

میں آپ سے یہ بات چھپانا چاہتا تھا کہ میں ۸ رمئی کو گھر جا رہا ہوں یہ خط آپ کو ایسے وقت ملے گا جب میں روانہ ہو چکا ہوں گا۔

کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اگر نہ لکھ سکا تو اوپر کا معذرت نامہ پہونچ جائے گا۔

۲۳ء میں جب میں جامعہ آیا تو اس وقت کچھ وقت تعلیم پاتا تھا باقی وقت محنت مزدوری کر کے اپنا گزر کرتا تھا۔ ۲۶ء میں جب آپ لوگ جامعہ تشریف لائے تو اس وقت بھی میرا یہی سلسلہ جاری تھا۔ رسالہ جامعہ کی دفتری کا کام میرے ذمہ تھا۔ جب میں نے یہ درخواست دی کہ میں اب پورے وقت جامعہ میں کام کرنا چاہتا ہوں تو غالباً ڈاکٹر صاحب نے یہ دیکھ کر کہ اس نے اپنی ہمت سے دونوں کام جاری رکھے میرا تقرر مدرّس کی حیثیت سے منظور کر لیا۔ میں نے اس عرصہ میں بچوں سے چند ڈرامے کروائے۔ ۲۸ء میں جب مجھے تکلیف ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے ڈاکٹر انصاری صاحب کے یہاں بھجواتے ہوئے یہ لکھا کہ "انھیں تندرست کر دیجئے تو ......" اس کے بعد موصوف نے مجھے موگا ٹرننگ کے لئے بھجوادیا واپسی پر مجھے ایک سند ملی جس میں یہ لکھا تھا کہ آپ ہر سال کے آخر میں اپنی کارکردگی اس سند میں لکھوادیا کریں تین سال کے بعد پکی سند ملے گی۔ ایک سال گزرنے پر جب میں نے یہ سند ڈاکٹر صاحب کے پاس بھجوائی تو موصوف نے یہ کہکر واپس کر دیا کہ "آپ کو اتنی فکر کیوں ہے ؟" اسے چاک

دیجیے تو اچھا ہے آپ کا کام ہی آپ کی سند کہلائے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے
معہ میں ہر طرح کام کرنے کی آزادی دی، جو کام میں نے چاہا، جس طرح کرنا چاہا اس میں ہر طرح
د کرتے رہے۔ وہ میرے کام پر اتنا اعتبار کرتے تھے کہ سلور جوبلی کے موقع پر ناظم بنایا۔

ڈاکٹر صاحب کے علی گڑھ جانے سے پہلے جو واقعات پیش آئے ہیں۔ ان میں سے چند کا
کر میں نے پیامِ تعلیم کے ذاکر نمبر میں کر دیا ہے۔ یہاں دوہرانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ آپ
چاہیں تو اس کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ لکھنے میں میرے لئے مشکل یہ ہے کہ میرے اور ڈاکٹر صاحب
کے جو تعلقات اور تاثرات ہیں وہ سب کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں ہیں۔ میں کوئی ادیب نہیں
ہوں اس لئے صرف واقعات ہی قلمبند کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ لیکن ان واقعات میں میری
تعریف کا پہلو بھی نکلتا ہے اس لئے نئے واقعات تلاش کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ "پیامِ تعلیم"
میں جو کچھ لکھا ہے وہ ادارے کی طرف سے لکھا ہے۔

ہاں تو میں علی گڑھ کا ذکر کر رہا تھا، اس کے بعد جب موصوف بہار کے گورنر ہوئے تو
میں نے اپنی ایک تازہ کتاب موصوف کے پاس بھیجی تھی۔ آپ نے جواب میں لکھا:

"تعلیمی کام میں آپ کا انہماک اور اس کے ساتھ آپ کا شغف، عمر بھر کا انہماک اور
شغف اپنی مثالیں کم رکھتا ہے۔ ہم ناکارے سوائے اس کے کہ تعریف کر دیں اور
دعائیں دے دیں اور کیا کر سکتے ہیں! خدا آپ کو تندرست اور خوش رکھے اور
آپ کی ذات سے طالبعلموں اور معلموں کو فیضیاب کرے۔"

میں اس خط کے اقتباس سے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ذاکر صاحب گورنر ہونے کے بعد
بھی جامعہ کی جدائی کس درجہ محسوس کرتے تھے۔

مجھے جب دوسری کتاب پر انعام ملا تو میں نے یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے پاس بھجوائی تھی۔
اس پر موصوف نے تحریر فرمایا:

"مرکزی حکومت کے ایک انعام کی مجھے اطلاع ملی تھی، دوسرے کی نہیں۔ یہ بے خبری!

نیم مردہ ہونے کی علامت ہے۔ مگر کچھ ایسا ہو گیا ہے اور اس میں کچھ میری افتادِ طبع کے ساتھ ساتھ حالات کو بھی دخل ہے کہ جن چیزوں کا گوشت اور ناخن کا سا تعلق تھا ان سے بھی بے تعلق پیدا کر لی ہے ایک فارسی شاعر نے میری حالت خوب بیان کی ہے ؎

بدنامیِ حیات دو روزے نبود بیش
آنہم کلیم با تو چہ گویم چساں گزشت
یک روز صرفِ بستن دل شد بہ این و آں
روزے دگر بہ کندن دل ازیں و آں گزشت"

ایک اور خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"آپ کی کتاب میں ان سچوں کا ذکر پڑھا جو اب بڑے ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ اچھے کام کر رہے ہیں۔ آپ کو ان کی یاد سے کتنی خوشی ہوگی۔ استاد کا یہ بڑا انعام ہے جو کم اوروں کو ملتا ہے۔

اس کے بعد ذاکر صاحب نائب صدر ہو کر دلّی آ گئے۔ جامعہ نگر اور نئی دلّی میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے مگر میں اپنی مجبوریوں سے موصوف سے بہت کم ملتا تھا۔ مگر میری یاد انھیں اتنی رہتی تھی کہ میرے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

"جامعہ سے کبھی کبھار کوئی آ جاتا ہے تو اس سے آپ کی خیریت پوچھ لیتا ہوں۔ میں چل رہا ہوں، خدا آپ کو بخیر رکھے۔"

آپ کا
عبدالغفار مدہولی
۸ رمئی ۶۹ء

---

(٢)

بذہ ص/ب ٣

٤ مئی ٦٩ء، اتوار

طیب صاحب ۔ السلام علیکم

کل ذاکر صاحب کے انتقال کی خبر ریڈیو پر سنی۔ آج اخبار میں تفصیل پڑھی۔ معلوم ہوا کہ کل
لو انھیں جامعہ ملیہ میں دفنایا جائے گا۔ آپ کی نظروں کے سامنے سب کچھ ہو گذرے گا۔
نصف صدی تک مسلسل کام کرنے والا شخص اب آرام کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ غریق رحمت
ے، وہ جتنے یتیم چھوڑ کر چلدئے بہت کم لوگوں نے اتنے یتیم بچے چھوڑے ہوں گے۔ میں خود
آپ کو یتیم تصور کر رہا ہوں حالانکہ اتنی دور ہوں اور ان سے برسوں سے کوئی تعلق نہیں رہا
ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کا تعلق ان سے مسلسل رہا ہو اور جو ان کے، اور ان سے، قریب
ہے ہوں ۔

عزم و استقلال کا ایک نمونہ کل دفن ہوگا۔ پیہم عمل کی ایک زندہ مثال زمین دوز ہوگی۔ جس
ت کے وہ نمونہ تھے اور جس مثال کے وہ حامل تھے انھوں نے زندگی بھر کوشش کی کہ وہ نمونہ
رسال ان کے بچے اپنے اندر پیدا کریں۔ انھوں نے محبت اور شفقت کے راستے سے اپنا
م کیا۔ خاموشی سے اپنے مشن کو چلایا، اور خاموشی چلدئے۔
والدہ کی موت کے بعد غم کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن آج بہت مغموم ہوں۔ مجھے اس موقعہ
ٓپ یاد آرہے ہیں۔ حارث صاحب یاد آرہے ہیں، اور مجیب صاحب یاد آرہے ہیں۔ غم
ہت سے لوگوں کو ہوگا لیکن سب سے میں واقف نہیں ہوں، ان تین شخصوں کے غم کا تھوڑا سا
ازہ میں لگا سکتا ہوں، ان کی والہانہ عقیدت کا مجھے علم ہے۔ اللہ تعلی صبر دے۔
خدا کرے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کی زندہ مثال کو ہمیشہ سامنے رکھ سکیں اور جب ان کی ملاقات
لئے جائیں تو تھوڑے سے یتیم ہم بھی چھوڑ جائیں۔

والسلام
خلیل

عقیدت کے پھول

(ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی یاد میں)

(۱)

واحد پریمی

"آہ وہ ماہِ درخشاں سو گیا"

مثلِ ماہِ نو جبینِ ہند پر
ایک مدت سے تھا جو تابندہ تر
جس کی ضو افشانیٔ احساس سے
خطۂ گنگ و جمن روشن رہا
جس کے انوارِ نظر سے آج تک
چہرۂ ارضِ وطن روشن رہا
جس کی آب و تابِ عقل و ہوش سے
"جامعہ"[1] مثلِ چمن روشن رہا
جس کی تنویرِ شعور و ذہن سے
اک جہانِ علم و فن روشن رہا
آہ وہ ماہِ درخشاں سو گیا
کیا کہیں کتنا اندھیرا ہو گیا؟

۱۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

(۲)

سیدہ فرحت

"اداشناسِ دلِ شیخ و برہمن ہے کہاں"

چمن اُداس ہے وہ زینتِ چمن ہے کہاں؟
اس انجمن میں وہ اب صدرِ انجمن ہے کہاں؟

روش روش ہے فسردہ، کلی کلی مغموم
بہارِ لالۂ و نسرین و یاسمن ہے کہاں؟

وہ علم و دانش و حکمت کا مہرِ تاباں تھا
فضا میں نور تھا جس سے وہ اب کرن ہے کہاں؟

جو دیکھتا رہا کثرت میں نورِ وحدت کو
اداشناسِ دلِ شیخ و برہمن ہے کہاں؟

کہاں ہے آج وہ قوم و وطن کا شیدائی
وہ فخرِ قوم وہ صد نازشِ وطن ہے کہاں؟

وہ اعتماد کا پیکر، وہ عزم کی تصویر
وہ اُس کی عالمِ پیری کا بانکپن ہے کہاں؟

وہ اپنے دل میں تھا انسانیت کا درد لئے
وہ دل کہاں ہے؟ اب اس دل کی وہ لگن ہے کہاں؟

سنائی دے گی نہ ہائے وہ پُر اثر تقریر
زباں خموش ہے پُرسوز وہ سخن ہے کہاں؟

کہاں سے پائیں گے اپنے کمال کی تحسین
وہ قدردانِ ہنرمند و اہلِ فن ہے کہاں؟

یہ کون کہتا ہے؟ ذاکر حسین ختم ہوئے!
یہ ہم سے پوچھو کہ وہ جانِ انجمن ہے کہاں؟

ہے ان کی روحِ عمل اب بھی زندۂ جاوید
وہ روح جس کیلئے مدفن و کفن ہے کہاں؟

وہ اپنے چاہنے والوں کے دل میں زندہ ہے
دلوں سے پوچھو وہ محبوبِ مرد و زن ہے کہاں؟

یہ بہرِ نذرِ عقیدت کے پھول ہیں فرحت
وفورِ غم سے مگر طاقتِ سخن ہے کہاں؟

سیّدہ فرحت

تضمین شعر مولانا حالی

(منجانب احباب جامعہ)

بزمِ احباب سوگوار ہے آج
خونفشاں چشم اشکبار ہے آج
بوئے گل باغِ خلد جا پہنچی
جسدِ گل تہِ مزار ہے آج
حُسن ہے آج محوِ خوابِ اجل
عشق بے تاب و بیقرار ہے آج
"دلِ محزوں کو کون دے تسکیں
ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج"

(۴۲)

عنوان چشتی

قدروں کا المیہ

اک صدی
ایک تہذیب نے آخری سانس لی
روح کی بستیاں ہیں کہ شمشان ہیں
ذہن کی وادیاں ہیں کہ ویران ہیں
فکر واحساس و ادراک کی سرزمیں
ایک نقطہ میں محدود ہے
غم سے مسدود ہے
از افق تا افق
زہرِ ظلمت کا دریا رواں ہوگیا
گھُپ اندھیرا زمان ومکاں ہوگیا
ہر نظر اک سیہ دائرہ بن گئی
ہر نفس شہرِ جاں میں دھواں بن گیا
ہر خوشی بجھ گئی دل میں غم کی طرح
ہے تصور بھی کالے عَلَم کی طرح

اک صدی

اک تہذیب نے آخری سانس لی
پتھروں کا مغنیِ آتش نفس
رنگ و بو، چاندنی، کہکشاں، پھول،، فن، نغمگی
ذہن و ظرف و ضمیر و خودی کا مزاج آشنا
آج خاموش ہے
بزمِ عالم سیہ پوش ہے

اک صدی

ایک تہذیب نے آخری سانس لی
ایک انسان
اک انجمن ایک تہذیب اک دور تھا
جیتے جی شعلۂ تشنگی کو بڑھاتا رہا
آرزوؤں کا جادو جگاتا رہا
شوق کو آزماتا رہا
اُس کی ہر جنبشِ لب میں سوز اور لے پیار کے تھے عیاں سو نہاں
دلدہی، آگہی، آشتی، دور بینی و خوش باطنی
اُس کے پیکر کا مفہوم تھی
مشرقی حسنِ اقدار کی دلکشی
اُس کی سیرت کا مقسوم تھی
ہر نظر روشنی

ہر قدم رہبری
ہر نفس بندگی ــــــ کر گیا
مر کے بھی زندگی کو امر کر گیا

اک صدی

ایک تہذیب نے آخری سانس لی
اس کے اندازِ فکر و خلوص و عمل کی رہیں
"جامعہ" کی زمیں
جسم و جاں کی امیں

اب بھی تابندہ ہے
اور تابندہ ہو
اس لئے غمزدو !
اشک آنکھوں میں ہوں جگنوؤں کی طرح
درد و غم دل میں ہو شمعِ جاں کی طرح
روح میں کرب ہو مشعلوں کی طرح
زندگی اُس کی تھی روشنی
موت بھی اُس کی ہے روشنی

(۵)

قمرؔ سنبھلی

قطعاتِ تاریخ

(۱)

مرگِ ذاکر حسین خاں سے قمرؔ سونا سونا ہوا ہے باغِ وفا
ہاتفِ غیب سے ملی تاریخ "آہ گُل ہو گیا چراغِ وفا"

۱۳۸۹ھ

(۲)

حیف صد حیف زمانے سے وہ صدرِ بھارت چلدئے چھوڑ کے گریاں ہمیں سوئے جنت
فکرِ تاریخ جو کی رحلتِ ذاکر کی قمرؔ غیب سے آئی صدا یہ "وہ غریقِ رحمت"

۱۹۶۹ء

(۳)

بزمِ عالم ہوئی ہے آج اُداس ہر طرف چھا گیا اندھیرا سا
لکھ قمرؔ سالِ رحلتِ ذاکر "خُلد میں آفتابِ علم گیا"

۱۳۸۹ھ

برکت علی فراق

ذاکر صاحب

(تاثرات)

تنے پیدا کن از مشتے غبارے تنے محکم تراز سنگیں حصارے
درون او دلِ درد آشنائے چو جوئے درکنارِ کوہسارے

جن لوگوں کو ذاکر صاحب سے قریب رہنے اور ان کے حلقۂ ارادت سے فیضیاب ہونے کا شرف نصیب ہوا ہے ــــــ اور جن کی حاشیہ نشینی کا فخر اس خاکسار کو بھی حاصل ہے ــــــ وہ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال کی یہ رباعی ہمیشہ مرحوم کے ڈرائنگ روم کی زینت بنی رہی۔ اگر پسندیدہ اشعار کسی کی سیرت و شخصیت کے آئینہ دار کہے جا سکتے ہیں تو میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ذاکر صاحب کی شخصیت انھی چار مصرعوں کی تفسیرِ مجسّم تھی۔ ذاکر صاحب کے ڈرائنگ روم کی زیب و زینت کا اگر کچھ سامان ہوتا تھا تو یہ رباعی اور اسی طرح چند اور مخطوطات تھے اور خوبصورت گلدان میں نہایت نفاست کے ساتھ لگا ہوا گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ۔ یہ مخطوطات زیادہ تر منشی علی محمد خاں صاحب مرحوم و مغفور کے لکھے ہوئے تھے جو جامعہ کے ابتدائی دور میں خطاطی کے استاد تھے۔

منشی علی محمد خاں صاحب کا ذکر آ گیا ہے تو یہ بھی عرض کر دوں کہ ذاکر صاحب منشی صاحب

نوٹ۔ یہ مضمون ۱۰ مئی ۱۹۶۹ء کو جامعہ کے تعزیتی جلسے میں پڑھا گیا۔

کا بہ کمالِ خلوص احترام فرماتے تھے۔ منشی صاحب کے احترام کے پیچھے دو محرکات کار فرما تھے، ایک یہ کہ منشی صاحب ذاکر صاحب کے اُستاد رہ چکے تھے اور دوسرے "وہ کمال" کے پرستش کی حد تک قدردان تھے۔ اپنے استادوں کا ذاکر صاحب بے حد احترام فرماتے تھے۔ منشی علی محمد خاں صاحب کے علاوہ جامعہ میں ایک اور استاد محترم جناب مولانا محمد شرف الدین صاحب یآس تھے۔ یہ بھی اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں ذاکر صاحب کے استاد رہ چکے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جب کبھی یہ دونوں بزرگ ان کے دفتر میں پہنچ جاتے تھے تو ذاکر صاحب اپنی جگہ چھوڑ دیتے تھے اور ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک موقعہ پر مولانا یآس نے ذاکر صاحب کی اس ادا پر فرمایا " ذاکر یہ مقام بلند اللہ نے تمھیں عطا فرمایا ہے۔ اس کے ایک ناچیز بندے کے سامنے تم اُسے چھوڑ دیتے ہو، یہ کفرانِ نعمت ہے۔" ذاکر صاحب نے نہایت ادب سے فرمایا "مولانا آپ کی موجودگی میں میرا وہ مقام نہیں ہے، میری جگہ وہی ہے جہاں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔"

منشی صاحب مرحوم کا یہ احترام اُن کے کمالِ فن کی وجہ سے بھی تھا۔ مجھے تو منشی صاحب سے شرف تلمذ حاصل نہیں ہوا اگرچہ جس زمانے میں مَیں جامعہ کی دسویں جماعت میں داخل ہوا تھا، اُس وقت وہ موجود تھے، لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے یکتائے روزگار خطاط تھے۔ اُن کے اکتساب کمال کے باب میں میں نے یہ روایت بھی سنی ہے کہ جب ایک استاد کی شاگردی میں تعلیم کی مدت پوری ہو گئی اور استاد نے انھیں سند عطا کی تو اُسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اس فن میں کمال پیدا کرنا چاہتے ہو تو رام پور جاؤ۔ وہاں ایک صاحب کمال بزرگ ہیں ان کی شاگردی اختیار کرو۔ منشی صاحب رام پور پہنچے اور استاد کو تختی لکھ کر دکھائی تو انھوں نے فرمایا "ہاں خطاطی کی ابجد سے واقف ہو، اگر میری شاگردی اختیار کرنا چاہتے ہو تو سات سال اور میرے پاس رہنا ہوگا۔" منشی صاحب رضامند ہو گئے اور رام پور میں بھی سات سال گذارے، تب کہیں جا کر استاد نے انھیں سند دی اور "سنگین قلم" کا

خطاب عطا فرمایا۔

ذاکر صاحب حیدر آباد میں جہاں ان کے والد ماجد فدا حسین خاں صاحب مرحوم وکالت کرتے تھے، ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے سب سے پہلے استاد ایک صاحب ماسٹر عبدالغنی تھے جو ایک نومسلم انگریز تھے۔ ثانوی تعلیم ڈاکٹر صاحب نے اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں حاصل کی جہاں انھیں اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب الطاف حسین صاحب مرحوم جیسے شفیق استاد کی رہنمائی حاصل ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم ایم۔ اے۔ او، کالج علی گڑھ میں حاصل کی جہاں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کالج کے طلبا کی انجمن کے وائس پریسیڈنٹ منتخب کئے گئے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک ترکِ موالات میں شریک ہو کر مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور گاندھی جی کی رہنمائی میں جامعہ کی برادری میں شریک ہوئے۔ جامعہ میں کچھ عرصے مولانا محمد علی کے زیر تلمذ رہ کر مزید تعلیم کے لئے جرمنی تشریف لے گئے وہاں بھی وہ ہندوستانی طالب علموں کی انجمن کے صدر رہے۔

جرمنی میں ایک پریس میں جس کا نام کاویانی پریس تھا، آپ نے کمپوزنگ کا فن سیکھا، اور دیوان غالب کا وہ شہرۂ آفاق نسخہ شائع کیا جو دیوان غالب جرمن ایڈیشن کے نام سے مشہور ہے۔ اس ایڈیشن کی کمپوزنگ خود ذاکر صاحب نے اپنے ہاتھ سے کی تھی۔ اس میں غالب کی جو رنگین تصویر چھپی ہے وہ ذاکر صاحب کے کمالِ بیان اور جرمنی کے ایک مشہور مصوّر کے کمالِ فن کا نتیجہ ہے کہ اس نے غالب کے خد و خال کا صرف بیان سن کر اُن کی کوئی شبیہہ دیکھے بغیر ان کی تصویر اس کامیابی سے اتاری کہ اب تک وہی تصویر ہندوستان کے دوسرے فنکاروں کے لئے ماخذ کا کام دیتی رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب جرمنی ۱۹۲۲ء میں تشریف لے گئے تھے اور ۱۹۲۶ء میں واپس تشریف لائے، اور اُسی سال جامعہ کے وائس چانسلر ہو گئے، اس کے بعد سے ۱۹۴۸ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہے اور جامعہ کے توسط سے ملک و قوم کی تعلیمی و تہذیبی زندگی کو سنوارنے میں ہمہ تن مصروف رہے۔

ذاکر صاحب سے میرا ذاتی تعلق ان کی زندگی کے اسی معلمانہ دور میں شروع ہوا جب ۱۹۳۲ء میں دو سال تک قید و بند کی زندگی گذار لینے کے بعد میں نے دسویں جماعت (ثانوی چہارم) میں داخلہ لیا۔ اُس زمانے میں ذاکر صاحب زیادہ وقت مدرسہ ابتدائی کے بچوں کو پڑھانے میں صرف کرتے تھے اور شاید دو تین پیریڈ ثانوی چہارم اور کالج کی جماعتوں کے لئے نکالتے تھے۔ جامعہ میں نئے طلباء کا داخلہ اُن کے معیار کی جانچ کرنے کے بعد ہوتا تھا، اور یہ دستور اب تک جاری ہے۔ میں ذاکر صاحب کے سامنے پہلی مرتبہ اسی تقریب سے حاضر ہوا۔ ان کی اپنے مخاطب کے اوپر ابرِ محیط کی طرح چھا جانے والی شخصیت سے پہلے تو میں بہت گھبرایا لیکن جب نہایت ہی نرم اور مشفقانہ لہجے میں ان کی زبان سے یہ الفاظ سنے کہ "کہو جیل میں رسیاں بٹتے بٹتے سب کچھ بھلا بیٹھے یا کچھ پڑھتے لکھتے بھی رہے!" تب میری جان میں جان آئی۔ میں نے عرض کیا "کسی نہ کسی صورت میں ایک آدھ کتاب حاصل کر کے پڑھتا تو رہتا تھا، ویسے آپ جانچ کر لیجئے۔" اُس زمانے میں Lamb's Tales from Shakespeare ثانوی چہارم کے انگریزی کے نصاب میں داخل تھی۔ مجھے یاد ہے، ڈاکٹر صاحب نے Merchant of Venice میں سے ایک ٹکڑا پڑھنے اور اس کا مطلب بیان کرنے کی فرمائش کی۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ پھر فرمایا "ٹھیک ہے۔ آپ چل سکتے ہیں، جائیے ثانوی چہارم میں نام لکھوا لیجئے" اور ٹسٹ پیپر پر "چل سکتے ہیں" لکھ کر دستخط فرما دئے۔ مجھے اپنے خوشخط ہونے پر بڑا ناز تھا، لیکن جب ٹسٹ پیپر پر ذاکر صاحب کا خط دیکھا تو ساری شیخی ہوا ہوگئی۔ کہتے ہیں بدخطی اور عظیم المرتبتی لازم و ملزوم چیزیں ہیں اور اس کے ثبوت میں گاندھی جی اور چند اور شخصیتوں کو پیش کیا جاتا ہے لیکن ذاکر صاحب کے خط پر نظر کیجئے تو یہ نظریہ باطل ہوجاتا ہے۔

اس واقعے کے بعد میں پانچ سال جامعہ میں طالب علم کی حیثیت سے زیر تعلیم رہا۔ میں اس قدر دبو واقع ہوا ہوں کہ بڑی شخصیتوں سے ہمیشہ گھبراتا رہا اور اب تک گھبراتا ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ذاکر صاحب سے ایک سال ثانوی چہارم اور تین سال کالج میں پڑھا اور پورے
پانچ سال ہوسٹل میں رہا، تاہم ذاکر صاحب سے میرا ربط ضبط بہت کم رہا۔ پھر بھی چند باتیں
زمانہ طالب علمی میں ایسی ہوئیں کہ میں انھیں عمر بھر نہیں بھول سکتا۔

طالب علمی کے زمانہ میں میرے اوپر نظریہ اشتراکیت کا بڑا اثر تھا۔ غالباً ثانوی ششم
کا واقعہ ہے: میں نے کالج کے طلبار کی یونین "انجمن اتحاد" میں "اشتراکیت اور لینن" کے عنوان
سے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ اس مقالے کی وجہ سے جامعہ میں میرا وجود تک خطرے میں آگیا تھا اور
طلبار اور اساتذہ دونوں حلقوں میں اس کا بڑا چرچا تھا۔ لیکن اسی مقالے پر مجھے انعام کا مستحق
بھی ٹھہرایا گیا تھا اور سال کے آخر میں جب انجمن میں انعامات تقسیم ہوئے تو ڈاکٹر اقبال
کا مجموعۂ کلام "پیام مشرق" مجھے انعام میں دیا گیا۔ میں یہ کتاب لے کر ذاکر صاحب کی خدمت میں
پہنچا اور درخواست کی کہ اس پر اپنے قلم سے کچھ لکھ دیجیے۔ موصوف نے فرمایا "بھئی لکھنا کیا ہے"
اور صرف دستخط کر دئے، پھر کچھ یاد کر کے فرمایا "یہ کتاب آپ کو اس مقالے کے انعام میں ملی
ہے نا!" میں نے عرض کیا "جی ہاں"۔ بولے "ہاں ہاں، تو لاؤ کتاب" اور کتاب میرے ہاتھ سے
لے کر اُسے کھولا اور پھر بند کر کے اپنے دستخط کے اوپر یہ شعر لکھا:

یکے خود را ز سوزِ خویشتن سوز　　طوافِ آتشِ بیگانہ تا کے

مکتبہ جامعہ کی ملازمت کے بعد ذاکر صاحب نے مجھے قرول باغ کے غیر مقیم طلبار کے مدرسہ
ابتدائی تعلیمی مرکز میں بچوں کو پڑھانے کا کام سپرد کیا تھا۔ مجھے پہلی جماعت میں بھی ایک گھنٹہ دیا گیا
تھا۔ بچے بیحد شور مچاتے تھے۔ میں پریشان ہوا کیا کروں۔ خیال آیا کہ کیوں نہ اپنا درد دل ذاکر
صاحب سے بیان کیا جائے۔ خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس وقت ذاکر صاحب جامعہ نگر کی بستی
میں قیام پذیر ہو چکے تھے۔ فرمایا "کہیے، بچے پریشان تو نہیں کرتے۔" اندھے کو آنکھیں مل گئیں۔
عرض کیا "بے حد پریشان کرتے ہیں اور اسی پریشانی کا علاج معلوم کرنے کی غرض سے حاضر
ہوا ہوں" فرمایا "پہلی اور ضروری شرط تو اس مسئلے میں یہ ہے کہ آپ کا بیان دلچسپ ہونا چاہیے،

جس کی صورت یہ ہے کہ آپ جو کچھ کہیں، اُسے ڈرامائی پیرائے میں کہیں۔ بچے بالکل شور نہیں مچائیں گے، لیکن پھر بھی اگر بچے بہت شور کرنے لگیں تو یکایک بولنا بند کر دیجئے، اور جو بچہ سب سے زیادہ شور مچا رہا ہو، اُس کے اوپر نظریں جما دیجئے۔ شور ختم ہو جائے گا۔ یا ایک چھوٹا سا ماؤتھ پیس جیب میں رکھے رہیئے، اُسے بجانا شروع کر دیجئے۔ بچے آپ کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔"

یہ گُر اتنا کارگر ثابت ہوا ہے کہ میں اب تک کہ ثانوی جماعتوں کو پڑھاتا ہوں، اس پر عمل کرتا ہوں اور کامیاب رہتا ہوں۔

تقریباً اسی زمانے کی بات ہے، میں مالی اعتبار سے بہت پریشان تھا۔ میرے ایک دوست بمبئی میں رہتے ہیں۔ انھوں نے میرے خطوط کی زبان سے میری خستہ حالی کی داستان سُنی تو ایک فلمی ہفتہ وار کے منیجر سے بات چیت کی اور میرے لئے پرچے کی ایڈیٹری کی بات اُن سے طے کر لی اور مجھے خط لکھا۔ میری عادت تھی کہ جب کبھی میری زندگی میں کسی موڑ کا موقع آتا تو میں ذاکر صاحب کے پاس استصواب کے لئے ضرور حاضر ہوتا اس موقع پر بھی گیا فرمایا۔ "اگر آپ طے ہی کر چکے ہیں تو مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ آپ اس پرچے کے کامیاب ایڈیٹر ثابت ہوں گے اِس کا مجھے یقین ہے، لیکن اگر مجھ سے مشورہ لینے آئے ہیں تو میں آپ کو ہرگز اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ ابھی تو صرف پریشانی ہے، جامعہ میں ممکن ہے آپ کو فاقے بھی کرنا پڑیں۔ میں آپ کو جامعہ میں فاقہ کرتے دیکھ کر زیادہ خوش ہوں گا بہ نسبت اس کے کہ آپ ایک فلمی پرچے کے ایڈیٹر کی حیثیت سے قیام پذیر ہوں"۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اندھیرے سے اُجالے میں آگیا ہوں۔ بمبئی خط لکھ دیا کہ میں نہیں آسکتا۔ اُدھر ذاکر صاحب نے یہ کیا کہ مجھے ایک رسالے میں علمی مضامین کا ترجمہ کرنے کی خدمت دلا دی جس سے تھوڑی سی آمدنی اور ہونے لگی اور میری پریشانی کا مداوا ہو گیا۔

جب میں ادارہ تعلیم و ترقی میں آیا اور شفیق صاحب مرحوم کی رہنمائی میں تعلیمی مرکزوں کی تحریک چلی تو ایک موقع پر جب ذاکر صاحب ایک نئے تعلیمی مرکز کا افتتاح کرنے تشریف لا

تھے، مجھ سے فرمایا: "برکت صاحب، آپ اتنے دنوں سے بالغوں کو تربیت دینے کا کام کر رہے ہیں مگر کبھی یہ بھی سوچا کہ آپ خود بھی تو بالغ ہیں، اور بالغوں کی تعلیم کا جدید ترین تصور یہ ہے کہ ہر بالغ کو چاہے وہ کتنا ہی پڑھا لکھا کیوں نہ ہو، تعلیم کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے، کہئے، آپ نے اپنی تربیت کس حد تک کی؟" ذاکر صاحب کے اس سوال کے اثر سے بالغوں کی تعلیم کے باب میں مجھے وہ حاصل ہوا جو شاید میں کتابوں پر کتابیں پڑھ جاتا تب بھی نصیب نہ ہوتا۔

حضرات! یہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ذاکر صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کے صرف ایک پہلو (ذاکر صاحب بہ حیثیت استاد) کی محض ایک معمولی سی جھلک تھی، آپ سب جانتے ہیں کہ وہ فلسفی تھے، مفکر تھے، معلم تھے، اور سب سے زیادہ یہ کہ ہندوستان کے مستقبل کے نقشہ نویس تھے، اور اس نقشے کے مطابق ہندوستان کے سماج کی تعمیر میں مصروف۔ ان کی اس ہمہ گیر شخصیت کا احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں، یہ چند سطریں تو میں نے زرہِ امتثالِ امر آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ ورنہ ذرے سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ خورشیدِ عالمتاب کا تعارف اور وہ بھی سیاروں سے کرائے۔

میں نے ان بے ربط اور غیر مرتب سطور کی ابتدا، ذاکر صاحب کے ڈرائنگ، روم میں آویزاں اقبال کی ایک رباعی سے کی تھی۔ اسی رباعی کے دوش بدوش حضرت شاہ سرمد کی ایک رباعی انھی منشی علی محمد خاں صاحب کی لکھی ہوئی، زیب دیوار رہتی تھی:

سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن بہ رضائے دوست می باید داد
یا قطع نظر زیار می باید کرد

جامعہ اور اس کے توسط سے پوری ہندوستانی قوم ذاکر صاحب کی محبوب تھی۔ ان کی پوری زندگی اور ان سے قریب رہنے والے ان کے احباب، رفقائے کار اور شاگرد مجھ سے زیادہ

جانتے ہیں کہ مرحوم نے اپنی پوری زندگی، اپنا تن من دھن اور آخر میں اپنی جان عزیز "بہ رضائے دوست" قربان کردی، اور آخر میں جس محبوب کے قتیل ناز تھے، اسی کی آغوش میں آرام فرما ہیں۔

ہم جامعہ والوں کی یہ خوش نصیبی ہے کہ ذاکر صاحب جامعہ ہی کی آغوش میں آسودۂ خاک ہیں۔ ان کا جسدِ خاکی اگرچہ ہمارے درمیان نہیں ہے لیکن ان کے نقوشِ قدم نہایت نمایاں ہیں، اور مجھے امید ہے کہ ہمارے لئے وہ ہمارے درمیان نہ ہوکر بھی چراغ راہ ثابت ہوں گے۔

میں ذاکر صاحب کے ایک معزز رفیق کار اور اپنے محترم استاد حضرت مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے اس شعر پر اپنی اس سمع خراشی کو ختم کرتا ہوں:

گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جامِ آتشیں
رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے

عبید الحق

ذاکر صاحب
ایک شاگرد کی نظر میں

دنیا میں ہر چیز کی قسمیں ہوتی ہیں، پھولوں کی، درختوں کی، انسانوں کی، اُسی طرح استادوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک اسکول کے انسپکٹر صاحب نے ایک لڑکے سے پوچھا "دیوان غالب کس نے لکھا ہے؟" لڑکے نے ڈر کر کہا "سچ کہتا ہوں میں نے نہیں لکھا" اُس کے اُستاد نے انسپکٹر کو سمجھاتے ہوئے کہا "دیوان غالب اِسی نے لکھا ہوگا۔ اس وقت قبول نہیں رہا ہے۔ مان جائے گا۔"

ٹیچروں کی ایک قسم وہ ہے جن کو ایک بوڑھا جج چالیس سال تک نہیں بھول سکا۔ ایک ٹیچر کسی جُرم کے سلسلے میں عدالت میں پیش کیا گیا تو جج کو اپنا چالیس سال پہلے اسکول کا زمانہ یاد آگیا چلا کر حکم دیا "پہلے اس کو بنچ پر کھڑا کرو اور مرغا بناؤ۔"

لیکن ایسے بھی اُستاد ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زندگی پر اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں اور ایسی باتیں سکھا دیتے ہیں جن کو نہ صرف ہم آپ یاد رکھتے ہیں بلکہ اپنی اولاد کو ورثے میں دے جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے جامعہ میں ایسے استادوں کی کبھی کوئی کمی نہ رہی۔

ہم نے نماز میں نہ پڑھنے پر اپنے عیسائی اُستاد کیلاٹ صاحب کی مار کھائی ہے اور

نوٹ: انجمن اتحاد جامعہ کالج کے "ذاکر ہاؤس" کے سالانہ جلسہ میں اس وقت یہ مضمون پڑھا گیا تھا جب ذاکر صاحب حیات تھے۔

کڑکڑاتی سردیوں میں اپنے گھر سے ہوسٹل تک آکر انھیں فجر کی نماز کے لئے جگاتے دیکھا ہے۔ مذہب کو قرآن وحدیث میں بند رکھنے اور نماز وروزہ تک محدود رکھنے پر مولانا اسلم جیراجپوری کی کڑی تنقید سنی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی بہت سی باتوں کو صحیح طور سے نہ برتنے پر اپنی جرمن آپا جان مس گرد افلس بورن کی نصیحتیں سنی ہیں، اور سپر ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی کلاس میں ادب واحترام کے باوجود اپنی ناسمجھی کی بنا پر ہنسے ہیں اور بعد میں شرمندہ بھی ہوئے ہیں مگر جن کے ذہنی سلجھاؤ کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جامعہ کا ایک طالب علم اوکھلے کی نہر میں ڈوب کر مرگیا تھا۔ ہم سب لوگ عابد صاحب کے پاس پہنچے اور یک زبان ہوکر کہا "پانی خطرناک چیز ہے۔ لڑکوں کا نہر میں تیرنا بند کر دینا چاہیے" ڈاکٹر صاحب سب کی باتیں سنتے رہے پھر کہنے لگے "تیرنا بند کیوں کرتے ہیں۔ تیرنا سب کو سکھا دیجیے نا"۔

پھر ہم مجیب صاحب کی صحبت میں رہے ہیں جو سگار کا دھواں تک ہونٹوں کے کونے سے نکالتے ہیں کہ سامنے والے کو تکلیف نہ پہنچے۔ جو چور کو چور کہنا تک پسند نہیں کرتے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری زندگی کے بعض دھندلے خاکوں میں جو پائدار رنگ پیدا ہوئے ہیں وہ سب انھیں کے لطف وفیض کا نتیجہ ہے۔

جامعہ کے ان غیر معمولی صلاحیتوں کے اساتذہ کی فہرست میں سب سے پہلے جو نام آتا ہے وہ ذاکر صاحب کا ہے جن کی تعلیمات چراغ سے چراغ روشن کرتی ہیں، اور لوگوں کو زندگی سے مقابلے کا گر سکھاتی ہیں۔

ذاکر صاحب سے میری سب سے پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا اور قرولباغ میں جامعہ کے ایک ہوسٹل خاکسار منزل میں رہتا تھا۔ اختر حسن صاحب فاروقی جن کو میں چچا کہتا تھا اور میرے والد ارشاد الحق صاحب اتالیق تھے۔ یہ دونوں ایک دن ایک مولانا صاحب کو ہماری بورڈنگ میں لائے ان کے ساتھ ایک میم صاحبہ بھی تھیں۔ ہم سب کو جمع کر کے مولانا صاحب نے بتایا کہ یہ تمھاری آپا جان ہیں جو جرمنی سے آئی ہیں تمھارے ساتھ

رہیں گی اور تم سب کی دیکھ بھال کریں گی۔ ہم بہت خوش ہوئے مگر کھدر کی ٹوپی، شیروانی اور پاجامے میں ان مولانا صاحب کو نہ پہچان پائے۔ اُن کے جانے کے بعد اختر صاحب نے بتایا کہ یہ ذاکر صاحب تھے ہمارے شیخ الجامعہ۔

شیخ الجامعہ کا لفظ میرے لئے اتنا ہی مشکل تھا جتنا تحتانیہ یا وسطانیہ، یعنی پرائمری اسکول یا ہائی اسکول، رفتہ رفتہ ان سب لفظوں سے مانوس ہوگیا اور شیخ الجامعہ سے زیادہ ذاکر صاحب سے اس لئے کہ وہ اکثر ہمارے ہوسٹل آتے اور ہماری جرمن آپا جان اُنھیں ذاکر صاحب ہی کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔

ایک دن ذاکر صاحب نے ہم سے کہا کہ آپا جان کو تم لوگ ابھی اردو بولنا سکھاؤ اور تم اُن سے انگریزی سیکھو اور جرمن بھی۔ آگے چل کر ان کی نصیحت اب بھی یاد ہے کہ زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھو، کچھ نہیں تو اُن سے واقفیت ضرور پیدا کرو۔ نہ سیکھنے سے محرومی رہتی ہے جس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا اور سیکھنے سے علم کے دروازے کھلتے ہیں۔

آپا جان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے یہ فائدہ ہوا کہ بول چال کی کچھ انگریزی آگئی اور جرمن الفاظ بھی سیکھ لئے تھے۔ ایک دن صبح صبح ناشتہ کے وقت ذاکر صاحب آگئے اور ان کے ساتھ آپا جان بھی تھیں۔ ہم نے "گوٹن مارگن" کہہ کر ان کا استقبال کیا پھر ہم نے اُن سے پوچھا "والن زی ملش ہابن"؟ یعنی کیا آپ دودھ پئیں گی؟ آپا جان نے اردو میں کہا نہیں، شکریہ" ہماری زبان سے جرمن اور آپا جان سے اردو سن کر ذاکر صاحب کو تعجب بھی ہوا اور بہت خوش ہوئے۔ وہ ہر اچھی تبدیلی پر خوشی کا اظہار کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس وقت کی ہر چھوٹی بڑی خوشگوار تبدیلی میں ذاکر صاحب کا براہ راست یا بالواسطہ دخل ضرور ہوتا۔

ساتویں کلاس میں ذاکر صاحب کی براہ راست شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ انگریزی بول چال کے ابتدائی آداب سب سے پہلے اُنھیں سے سیکھے۔ نسفیلڈ کی گرامر اور پارزنگ کرتے کرتے طبیعت اُکتا چکی تھی کہ ایک دن کلاس میں ذاکر صاحب تشریف لائے اور کتاب پڑھانے

کے بجائے انگریزی میں باتیں شروع کر دیں ۔ نام پوچھے ، مزاج پوچھا گھر کے بارے میں دریافت کیا اور ہمارے محبوب مشغلے معلوم کئے ۔ وہ پہلا دن تھا جب ہمیں معلوم ہوا کہ How do you do? ہے کب کہتے ہیں اور اس کا صحیح جواب Fine Thank you نہیں بلکہ How do you do? ہی ہے ۔ اس دن انھوں نے ہم کو بہت سے جرمن اور انگریزی لطیفے سنائے ۔ لطیفے سنانے کا انھیں بہت شوق ہے ۔ کلاس کا وہ دن ہمارے لئے اتنا خوشگوار تھا جس کا لطف میں آج تک نہیں بھولا ۔

کالج میں بھی ذاکر صاحب کے پڑھانے کا یہی انداز تھا ۔ مشکل لفظوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے اور اپنی بات کو اس طرح سمجھاتے جیسے اس وقت ہم ہائی اسکول میں پڑھتے ہوں ۔ "میری قابلیت اور میرا علم بے معنی ہے اگر اس کو آپ تک نہ پہنچا سکوں ۔" "میری کامیابی تو اس پر ہے کہ آپ میری بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں ۔" طالب علموں کو بھی یہی ہدایت کرتے کہ امتحان میں جواب دیتے وقت وہ اپنی بات کو اس طرح سمجھائیں گویا امتحان لینے والا جاہل مطلق ہے یا وہ ایک بچہ ہے جس کی سمجھ کم ہے ۔

فرسٹ ایر میں معاشیات کیا ہے ؟ کے عنوان سے ہمیں ایک مضمون لکھنے کے لئے دیا گیا ۔ کلاس میں کئی ہفتے پڑھنے کے بعد بھی اچھی طرح سمجھ میں نہ آیا تھا ۔ بہرحال مضمون لکھ کر لے گیا مگر اتفاق سے اُس دن ہمارے استاد بیمار پڑ گئے اور ان کی جگہ پر ذاکر صاحب خود تشریف لے آئے ۔ حسب عادت اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھا "معاشیات کا مضمون پسند ہے ؟" سب خاموش تھے میں نے کہدیا "جی ہاں ۔ پسند ہے ۔" "مضمون تو لکھ لیا" "جی ہاں" "تو پھر بسم اللہ ، سنائیے" مجھے تکلف تھا مگر ان کے حکم سے پڑھنا شروع کر دیا ۔ دو صفحے سننے کے بعد جب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو فرمایا "مضمون کی ابتدا تو بہت اچھی ہے ۔ زبان بھی فصیح و بلیغ ہے ۔ کن کن کتابوں سے استفادہ کیا ؟" میں اس کا جواب کیا دیتا ۔ کاٹو تو میرے جسم میں لہو نہیں ۔ میری پریشانی دیکھ کر خود ہی فرمانے لگے "آپ نے تو ایک ہی کتاب پڑھ کر اس مضمون کو اتنا سمجھ لیا اور اس کتاب

کے مصنف نے تو بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں جب بھی وہ جاہل ہے۔" میری شرمندگی کی کوئی انتہا نہ تھی اس لیے کہ جس کتاب کے دیباچے کو نقل کر کے لے گیا تھا اس کے مصنف خود ذاکر صاحب ہی تھے۔

دوسرے دن وہ کلاس تشریف نہیں لائے، مگر سالانہ امتحان سے دو مہینے پہلے وہ ہمیں معاشیات ضرور پڑھاتے تھے اُن کا دفتر ہماری کلاس تھی۔ وہیں بلا لیتے اور فرش پر بیٹھے بیٹھے پڑھاتے۔ دوسرے مضمونوں کی طرح معاشیات بھی ایک لازمی مضمون تھا۔ اگر اختیاری ہوتا تو اس طرف توجہ نہ کرتا مگر ذاکر صاحب نے اس میں ایسی دلچسپی پیدا کر دی کہ امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گیا۔ خشک اور مشکل مضمون کو دلچسپ اور سہل انداز میں پڑھا دینا ذاکر صاحب کا بہت بڑا فن تھا۔

ہم اپنے استادوں کا بہت ادب کرتے تھے خواہ کالج کے ہوں یا مدرسہ ابتدائی کے۔ اُستاد سے بدتمیزی یا گستاخی کا ہمیں تصور ہی نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی جھوٹ ضرور بول دیتے تھے۔ ذاکر صاحب کو اس سے بھی بڑی نفرت تھی۔ ان کو اس سے تکلیف ہوتی کہ وہ اپنا قیمتی وقت دے کر کلاس آئیں اور ہم میں سے کوئی غیر حاضر ہو۔ میرے ایک پٹھان دوست چار روز کے بعد جب کلاس میں آئے تو ذاکر صاحب نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی معلوم ہوا کہ وہ شدید بخار میں مبتلا تھے۔ "تو آپ نے کسی ڈاکٹر کو بھی دکھایا؟" "جی ہاں کل ڈاکٹر شرما کو دکھانے شہر گیا تھا اور اس کے بعد نماز پڑھنے جامع مسجد چلا گیا۔"

"تو کیا ڈاکٹر شرما نے دہی بڑے بھی لکھے تھے جسے آپ گھنٹہ گھر پر بیٹھے کھا رہے تھے؟ اور اس سے فائدہ نہ ہوا تو ڈاکٹر سیتا کو دکھانے جامع مسجد چلے آئے اور نماز تو آپ نے سیڑھیوں پر ہی ادا کر دی تھی۔ کتنی قلفیاں کھائیں؟" ذاکر صاحب کے ہر انکشاف پر میرے دوست مسلسل انکار کیے جاتے۔ جب جھوٹ برداشت نہ ہوا تو ان کو کلاس سے باہر نکال دیا۔ جب ذاکر صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو بتایا کہ انھوں نے خود انھیں سیتا کباب والے کی دوکان سے نکلتے اور

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر قلفیاں کھاتے دیکھا تھا۔

وہ کبھی کبھی فرماتے سب سے بدقسمت وہ ہے جو اپنے استاد کی عزت نہ کرے۔ جھوٹ بولنا بھی اسی کے برابر ہے۔ جھوٹ بول کر طالب علم اس رشتے کو کمزور کر دیتا ہے جو اُستاد او ر طالب علم کے درمیان ہوتا ہے۔ اور یہ عادت تو اللہ کی برکتوں سے بھی محروم کر دیتی ہے۔

"جو کام اس قابل ہے کہ کیا جائے وہ اس قابل ہے کہ اسے اچھی طرح کیا جائے" ذاکر صاحب کا یہ قول کس کو یاد نہیں۔ اپنے ساتھیوں سے وہ یہی اُمید رکھتے اور طالب علموں کو بھی یہی نصیحت کرتے "کام سے انکار کر دو یہ کہیں بہتر ہے اس سے کہ ذمے داری لی جائے اور پوری نہ کی جائے۔"

ذاکر صاحب کام لینے کے ڈھنگ سے خوب واقف تھے اور اس کا ایک راز تھا۔ وہ ہر ایک سے ہر طرح کے کام کی امید نہ رکھتے بلکہ جس میں جو صلاحیت دیکھی اُسے ویسا کام دیدیا۔ کسی میں انتظامی صلاحیت ہے تو اُسے اس کام کا موقع دیدیا۔ کسی میں تعلیمی صلاحیت دیکھی تو اُسے اُس طرف متوجہ کر دیا۔ اس طرح کام کرنے والا بھی خوش رہتا اور کام لینے والے کو بھی اطمینان رہتا۔ اور پھر ان کے نزدیک ہر کام کی عزت تھی۔ کام کرنے والوں میں وہ کوئی تفریق نہ کرتے اگر ایسا کرتے تو وہ پچیس ۲۵ برس تک اپنے ساتھ سب کو لے کر کیسے چلتے۔ ایک طرف وہ مطبخ کے باورچی اور دفتر کے چپراسی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے تو دوسری طرف نگراں صاحبان کی ہمت افزائی میں بھی کوئی کمی نہ آنے دیتے۔

استادوں اور طالب علموں کی ہمت افزائی کے عجیب عجیب طریقے تھے۔ تقریر بھی، تحریر بھی، مگر سب سے زیادہ عمل۔ جب ہماری کوتاہیوں کی طرف توجہ دلاتے تو اس کا بھی ایک انداز تھا۔ ضرورت پڑتی تو بے دھڑک ایسے کام بھی کر دکھاتے جن کو ہم سماجی اعتبار سے گھٹیا سمجھتے ہیں۔ اس طرح دیکھنے والے کے دل پر ایسا اثر ہوتا کہ زندگی بھر بھلائے نہ بھولتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک زمانے میں جب وہ مدرسہ ثانوی کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے ایک بورڈنگ کے

پاخانوں کی صفائی بھنگی کی بڑی جھاڑو اٹھاکر خود اپنے ہاتھوں سے کی اور دیکھنے والے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد مجمع کے ترانے میں جو تقریر کی اس کا موضوع پاخانوں کی صفائی تھا۔ "اگر ہم ان کو صاف نہیں رکھ سکتے تو ہمیں یہ عمارتیں چھوڑ کر جنگل میں بس جانا چاہیئے۔"

جوبلی سے پہلے ذاکر صاحب نے کچھ دنوں کے لئے مجھے مدرسہ ابتدائی میں اتالیق بنادیا اور پڑھانے کا کام بھی سونپ دیا۔ ایک دن صبح کو کلاس جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اک بارگی شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اوپر سے جھانک کر دیکھا تو ذاکر صاحب ہاتھ میں ایک پتھر لئے ڈائننگ ہال کی ایک کھڑکی کے شیشے توڑ رہے تھے۔ کچھ ملازم بھی جمع ہو گئے تھے۔ ذاکر صاحب نے اطمینان سے ہاتھ صاف کئے، جیب میں رکھے اور آگے بڑھ گئے۔ ناظم مطبخ سے صرف اتنا کہا کہ "یہ شیشے بہت گندے تھے، اب آپ کو زحمت نہ کرنا پڑے گی، میں نے انھیں اب بالکل صاف کردیا ہے۔ چیزوں کو اگر سلیقے سے نہ رکھا جائے اور ان کی حفاظت نہ کی جا سکے تو اُن کے استعمال کا ہمیں کوئی حق نہیں۔" بورڈنگ میں چارپائیاں ٹیڑھی دیکھ کر مرزا مظہر جان جاناں کی یاد دلاتے کہ جب وہ سڑک پر چلتے ہوئے کسی چارپائی کو ٹیڑھی بچھی دیکھتے تو اسے سیدھا کر دیتے کیوں کہ اُن کے نزدیک ٹیڑھی چارپائی سے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ پھولوں خاص طور سے گلاب سے ذاکر صاحب کو جو شیفتگی ہے وہ کون نہیں جانتا۔ اس شوق کو انھوں نے اپنے ہی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ دوسروں میں بھی پیدا کیا۔ جب پہلی مرتبہ انگلستان سے گلاب کے پودے لائے تو جامعہ میں ان کا بہت چرچا تھا۔ چھوٹے چھوٹے چنبیلی کے پھول کے برابر۔ اس کو دیکھنے روز ایک چکر لگاتے۔ ایک دن پوچھ لیا "پسند ہیں؟" میں نے کہدیا کہ "یہ تو بہت چھوٹے ہیں۔" فرمایا "ہر چیز کا اپنا حُسن ہوتا ہے۔ چھوٹے ہیں مگر ان کی بھی اپنی خوبصورتی ہے جو بڑے پھولوں میں نہیں۔" اس کے بعد میری شیروانی کے کھلے ہوئے بٹن اپنے ہاتھ سے بند کئے اور آگے چل دیئے۔ "بٹن صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ اُنھیں لگایا جائے۔"

بی اے پاس کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ بمبئی جاکر آرٹ کی تعلیم حاصل کروں۔

مجھے اپنے دفتر بلا کر اس خواہش کی وجہ پوچھی میں نے کہا "روپیہ پیدا کرنا چاہتا ہوں"۔ "تو پھر ڈاکہ کیوں نہیں مارتے، یا پھر کسی فلم ایکٹرس سے شادی کرلو۔ پیسے کمانے کے تو اور بھی طریقے ہیں"۔ میں چپ رہا، میری آزمائش کے لئے مشورہ دیا کہ استادوں کے مدرسے میں ٹریننگ لے لوں۔ مگر مجھے چرخے اور باغبانی سے دلچسپی نہ تھی اور بنیادی تعلیم کا استاد بننا نہیں چاہتا تھا۔ چرخے پر گاندھی جی کا حوالہ دیا اور باغبانی پر استاد محترم مجیب صاحب کے شوق کا ذکر کیا کہ اپنے ہاتھ سے باغبانی کرتے ہیں کتنے اچھے پھول لگائے ہیں اور ترکاریاں پیدا کی ہیں۔

آخر کار میری خواہش کو مان گئے مگر ایک نصیحت کی، "آرٹ ضرور سیکھئے مگر اس سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایئے۔ آرٹسٹ بن جانا آسان ہے لیکن یہ نہ بھولئے کہ تعلیم کی ہر منزل پر آرٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

پھر ۵۴ء میں علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے اور جامعہ تشریف لائے تو خوش خبری سنائی کہ مزید تعلیم کے لئے امریکہ جارہا ہوں فرمایا "مگر بھائی اب جامعہ میں رہ کر بھی کچھ کام کر ڈالئے۔ کہاں تک پڑھئے گا۔ کام کرنے والے ڈگریوں کے بغیر بھی کام کر لیتے ہیں۔"

جامعہ میں جوبلی کے موقع پر استادوں اور طالب علموں نے جس خلوص اور انہماک سے کام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا۔ تعلیم کے ساتھ مزدوروں کی طرح کام کئے، سڑکیں بنائیں، سر پر مٹی ڈھوئی۔ پنڈال میں زمین ہموار کرنے سے لے کر فرش اور کرسیاں بچھانے تک کا کام کیا۔ ایسے موقعوں پر ذاکر صاحب کی حیثیت کسی افسر یا نگراں کی سی نہ رہی بلکہ ہر کام کو کرنے میں وہ سب کے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ کام کو عبادت سمجھ کر کرنا اور دوسروں کے سامنے اس کی مثال پیش کرنا ان کا ہمیشہ سے ایک وطیرہ اور شعار رہا ہے۔

ملک میں ہر طرف فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے، دہلی کی فضا بھی بہت خراب تھی،

دہلی کی تاریخیں قریب آئیں تو دلی کے بیشتر علاقوں میں کرفیو تھا۔ عام خیال تھا کہ دوسرے دن
افتتاحی جلسہ نہ ہوسکے گا۔ ذاکر صاحب کا وہ جملہ اب تک یاد ہے "فکر نہ کیجئے۔ آپ کی محنت
رائگاں نہ جائے گی۔ کوئی نہ ہوگا تو ہم آپ تو ہوں گے۔ میں ان خالی کرسیوں کے سامنے تقریر
کروں گا۔" مگر دوسرے دن شاندار جلسہ ہوا۔ ہر سیاسی پارٹی کے چوٹی کے لیڈر موجود تھے ۔
مولانا آزاد، پنڈت نہرو، راجہ جی، محمد علی جناح، لیاقت علی خاں، اُس جلسے میں ذاکر صاحب نے
اس وقت کی چھوٹی سی جامعہ کے کاموں کا تعارف کرایا اور اُن رہنماؤں کے سامنے جو آسمان سیاست
کے ستارے تھے جس درد بھرے انداز میں فسادات اور معصوم بچوں کے قتل کا ذکر کیا اُن کے
الفاظ کی گونج آج بھی اپنے کانوں میں محسوس کرتا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ ذاکر صاحب کی شخصیت بہت پیاری ہے۔ اور وہ سچ ہی کہتے ہیں۔ لیکن آخر
وہ کونسی بات ہے جس سے وہ ہر ایک کا دل موہ لیتے ہیں۔ شخصیت کو خانوں خانوں میں
تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ذاکر صاحب کی شخصیت کی بنیاد عمل ہے۔ اُن کو قدرت نے
اس وصف سے مالامال کر دیا ہے کہ وہ ہر ایک کو ساتھ لے کر کام کر سکیں۔ جامعہ کی زندگی
میں انھوں نے مختلف خیال کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر کھڑا کر دیا جن میں مسلمان، ہندو،
عیسائی، کانگریسی، مسلم لیگی، کمیونسٹ، آزاد خیال اور کٹر سے کٹر مذہبی سب ہی طرح کے لوگ
ہے۔ ان تمام لوگوں کو لے کر اتنا خوبصورت گلدستہ بنائے رکھا جس کی رنگینی، جس کی
دلکشی اور جس کی خوشبو آج بھی باقی ہے۔

آپ شاید میری ان باتوں کو میرے جذبات پر محمول کریں۔ اس لئے کہ اب زمانہ بدل گیا
، جامعہ بہت بڑی ہوگئی ہے، جامعہ اب ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ ہے، اچھی عمارتیں ہیں، اچھی
راہیں بھی، مگر ان سب کے ساتھ ایک سچائی یہ بھی ہے کہ ہم پہلے سے بھی زیادہ بے چین
، اور اب ذرا ذرا سی بات پر شکایتیں کرتے ہیں۔ چند دن ہوئے کچھ طالب علموں نے
مضمون کے مشکل ہونے کی شکایت کی۔ مجھے اُس وقت ذاکر صاحب یاد آگئے۔ اُن کے پاس

کچھ طالب علم گئے اور کہا انگریزی بہت مشکل مضمون ہے۔ کچھ کیجئے۔ ذاکر صاحب نے فرمایا کہ یہ شکایت میں چار پانچ سال سے سن رہا ہوں۔ اس تمام عرصے میں اگر آپ چاہتے تو انگریزی کا صرف ایک لفظ روز اور یہ بھی توفیق نہ ہوتی تو دو دن میں ایک لفظ یاد کر لیتے اور اس کا استعمال سیکھ لیتے تو مجھ سے اچھی انگریزی ہو جاتی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آپ آئندہ دس برس تک اسی طرح شکایت کرتے رہیں گے

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جس چمن کی آبیاری میں لیاقت سے زیادہ خلوص، شخصیت سے زیادہ ایثار اور مروّت سے زیادہ محبت کارفرما رہی ہے آنے والے لوگ اُس چمن کی بہار قائم رکھ سکیں گے ؟

عبداللہ ولی بخش قادری

"متاعِ کارواں جاتا رہا!"

جامعہ نگر ڈاکخانے کے نزدیک سڑک پر کھڑے کھڑے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس وقت آس پاس کی چھوٹی بڑی سب دکانیں بند تھیں۔ کسی طرف کوئی چہل پہل نہ تھی۔ بس یہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ عجب سراسیمگی کا عالم تھا۔ نہ بات کرتے بنتا تھا اور نہ خاموش رہا جاتا تھا۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کوئی ضبطِ الم کا نمونہ تھا تو کوئی رقتِ قلب کا مظہر۔ اِن سب غم کے ماروں کو جامعہ لاری کا انتظار تھا جو دو بجے دوپہر کے قریب راشٹرپتی بھون کے لئے روانہ ہوئی تھی مگر خلاف توقع ابھی تک واپس نہ آئی تھی۔ اتنے میں ایک ٹیکسی آکر رُکی اور اُس سے جامعہ کے مسجل (رجسٹرار) اور شیخ الجامعہ کے سکریٹری اُترے۔ انھیں دیکھ کر دو چار بے چینی سے آگے بڑھے اور باقی سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ وہ دونوں سب کے پاس آکر رُک گئے۔ دو چار جو ادھر اُدھر کھڑے تھے وہ بھی دوڑ آئے۔ "لاری کہاں ہے؟۔ ابھی تک نہیں آئی؟" کوئی مضطربانہ انداز میں بول پڑا۔ "لاری آتی ہی ہوگی۔ کوئی بھی اندر نہیں جاسکا ہے۔ سب واپس آرہے ہیں۔ رات کو جاسکیں گے۔" اتنی سی بات مگر بڑی دشواری سے سکریٹری صاحب کہہ پائے تاہم ان کی بھرائی ہوئی آواز نے سننے والوں کے دل ہلا دیے۔ ان میں مزید کچھ کہنے کی سکت نہ دیکھکر "ہاں ہاں آپ گھر جائیے" کہتے ہوئے انھیں ایک بزرگ نے آگے بڑھادیا۔ اب لوگ مسجل صاحب کی طرف رجوع ہوئے۔ اُن کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ کسی طور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اُن سے دریافت کیا گیا تھا کہ صدر مرحوم کی

آخری آرام گاہ کہاں ہوگی تو انھوں نے کہہ دیا ہے کہ "جامعہ میں" اور سامنے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے کہ "جہاں تک جگہ کا تعلق ہے، بھئی، میں نے تو یہ سامنے والا ٹیلہ بتادیا ہے۔ اس کی وجہ ہے، پھر بتاؤں گا۔" اتنا سنتے ہی دو ایک ہلکی سی آوازیں ایسی اٹھیں گویا ان کی بات پسند کی جارہی ہو اور لوگ منتشر ہونے لگے۔ اس دوران میں جبکہ لوگ یہاں انتظار میں کھڑے تھے ہر نووارد ریڈیو کی تازہ خبریں سناتا۔ لہٰذا وفات کے حالات اور تجہیز و تکفین کے انتظامات کا پتہ چل ہی چکا تھا اور اب لاری کا انتظار بھی بے سود تھا۔ لہٰذا سب نڈھال اور دل گرفتہ اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹنے لگے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی لٹے ہوئے قافلے کے بچے کھچے افراد اپنی راہوں پر بس چل پڑے ہوں۔ اس وقت رہ رہ کر مجھے خیال آرہا تھا کہ دو سال ہونے آئے۔ یہی مہینہ تھا اور ایک ایسی ہی دوپہر جبکہ اسی لاری میں اور اسی جگہ سے کچھ ایسے ہی اشخاص ذاکر صاحبؒ کو ان کے صدر جمہوریہ منتخب ہونے کی خبر پاتے ہی، اُن کے حضور اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ آج اگرچہ کم و بیش علامات وہی تھیں لیکن کیفیات قطعی برعکس۔ سب کے دل ٹوٹے ہوئے تھے۔

یہ ۳ مئی ۶۹ء ایک عام دن کی طرح آئی تھی مگر ½ ۱۱ بجے کے قریب راشٹرپتی بھون سے ٹیلی فون پر ذاکر صاحبؒ کی بڑی صاحبزادی سعیدہ آپا کو اس حادثہ جانکاہ کی خبر ملی تھی کہ کایا پلٹ ہوگئی۔ اُن کی آہِ دل خراش کا نکلنا تھا کہ جامعہ نگر کا دل چرتا چلا گیا۔ اس اطلاع کے کچھ ہی دیر بعد راشٹرپتی بھون کی ایک کار آکر اُنھیں لے گئی تھی۔ اُن کا گھر سونا ہوگیا مگر اُس کی بے چینی کو دوسرے گھروں نے بانٹ لیا تھا۔ کچھ لوگ گھبرائے ہوئے یہاں آکھڑے ہوئے لیکن یہ نہ جانتے تھے کہ کیوں کھڑے ہیں۔ بس مکان کو دیکھ لیتے تھے۔ یہ ذاکر صاحبؒ کا اپنا مکان ہے۔ باہر سے اس کی سج دھج ایک کوٹھی کی سی ہے۔ آج سے تقریباً پینتیس سال قبل جب انھوں نے جامعہ نگر بسایا تب یہ بھی بنایا اور یہیں رہ کر وہ جامعہ کی تعمیر و تشکیل کرتے رہے۔ یہ جامعہ نگر کا جنوبی سرا ہے۔ یہاں پر مکتبہ جامعہ کا صدر دفتر اور ٹیچرز کالج واقع ہیں۔ جامعہ نگر اوکھلا گاؤں کی گود میں

بسا ہوا ہے ۔ متھرا مارگ سے کٹ کر اوکھلا مارگ ادھر کو آتی ہے ۔ پہلے جلیا نا گاؤں پڑتا ہے ۔ پھر ہولی فیملی اسپتال آتا ہے ۔ اس کے بعد جامعہ کالج کی عمارتیں ملتی ہیں اور ان کے بعد مدرسہ ابتدائی اور ثانوی کی ۔ مدرسہ ابتدائی کے مقابل سڑک کے پار جامعہ بس اسٹینڈ، جامعہ کواپریٹو اسٹور، ڈاک خانہ اور چند دکانیں ہیں ۔ ان کے پیچھے کچھ ہٹ کر ایک بڑی عمارت واقع ہے جس کے بالائی حصے میں جامعہ کے دفاتر ہیں اور نیچے مرکزی لائبریری ۔ اوکھلا مارگ سے مدرسہ ثانوی کے آخری پھاٹک کے سامنے سے ایک سڑک کٹتی ہے جو سیدھی اوکھلا نہر کی طرف چلی جاتی ہے ۔ اس پر ایک طرف جامعہ کے اسٹاف کوارٹر واقع ہیں اور ان کے سامنے شیخ الجامعہ صاحب کی کوٹھی اور چند دیگر مکانات ۔ اسی سڑک کی ایک شاخ اور نکلی ہے جو اسی کے ساتھ ساتھ ذرا ہٹ کر اسی سمت میں بلی آتی ہے ۔ اسے گل مہر لین کہتے ہیں کیونکہ یہاں گل مہر کے بہت سے پیڑ ہیں ۔ بس یہ جامعہ نگر کا آخری سرا آگیا اور ذاکر صاحبؒ کا مکان ۔ جامعہ نگر کا طول تو اتنا ہی ہے ، عرض میں کچھ اور اضافہ کر لیجئے ۔ یہ وقت بڑے کرب میں گزرا ۔ کسی بھی تفصیل کا پتہ نہ چلتا تھا ۔ ابھی تک سرکاری اعلان نہ ہوا تھا ۔ ریڈیو اپنے معمول کے مطابق پروگرام پیش کر رہا تھا ۔ لیکن پھر بھی اِدھر اُدھر سے جامعہ کے دفاتر میں ٹیلی فون آنے لگے تھے ۔ لوگ بڑے محتاط لہجے میں اس خبر کی تصدیق چاہتے ۔ لیکن یہاں کسے یارا تھا کہ ’ہاں‘ کہتا ۔ آدھا پونا جواب دے کر خاموشی اختیار کر لی جاتی اور بھی خود راشٹرپتی بھون ٹیلی فون کرنے کی سعی ہوتی ۔ اتنے میں ریڈیو پر خبریں آنا شروع ہو گئیں ۔ اگرچہ جانتے تھے کہ حادثہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک پھر بھی اپنے آپ کو کچھ جھٹلا سا رکھا تھا مگر اب واتنی بھی گنجائش باقی نہ رہی تھی ، کوئی غم سے مضطرب اور بے قابو تھا اور کسی پر سکتے کا سا عالم طاری تھا ۔ کہرام تو نہ تھا مگر سارا جامعہ نگر سناٹے میں ضرور آکر رہ گیا تھا ۔ لوگ سدھ سے بے سدھ ہو رہے تھے ۔ جب کبھی ہم لوگوں کو جامعہ نگر سے باہر جانا مقصود ہوتا ہے تو عموماً لاری انتظام کر لیتے ہیں ۔ جو ڈاک خانے کے پاس سے ہی روانہ ہوا کرتی ہے ۔ خبریں سنتے ہی اکثر و بیشتر اضطراب کے عالم میں ڈاک خانے پر آ گئے تھے ۔ لاری کا بھی انتظام ہو گیا تھا ، چلنے

لوگ لان میں بیٹھ سکتے تھے، وہ جا چکے تھے، باقی تقریباً دو گھنٹے لاری کا انتظار کرنے کے بعد اب مایوس ہو کر لوٹ رہے تھے۔

اس وقت اِن واپس آنے والوں کو اگرچہ ایک ہی غم ستا رہا تھا مگر پھر بھی سب کا اپنا اپنا رنج تھا۔ اُن میں کوئی ہمدم دیرینہ تھا، کوئی شاگرد۔ کوئی نیاز مند اور کوئی معتقد۔ ہر ایک کا اپنا تعلق تھا، اپنی ارادت مندی اور اپنی اپنی ذہنی پرچھائیاں۔ یوں ہی گم سم لوگ اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔ لیکن اب سکون کہاں تھا۔ عموماً ریڈیو پر کان لگے ہوئے تھے۔ ہر گھر میں وہی ایک ذکر تھا ہر دل میں وہی ایک یاد۔ کوئی اللہ والا، ایصال ثواب کی نیت سے کلام پاک کی تلاوت میں مشغول ہو گیا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے یونہی کٹ گئے اور شام ہوتے ہوتے پھر لوگ گھروں سے نکلنا شروع ہوئے۔ سب ہی کو ایک دوسرے کا سہارا درکار تھا۔ جہاں کہیں کسی دوست یا شناسا سے ملاقات ہوتی ایک دوسرے کو اپنے اپنے انداز میں تسکین دیتا، کچھ سُنتا اور کچھ سُناتا۔ اسی وقت مرکزی لائبریری کے پاس دہلی کے متعدد حکام اعلیٰ کی موٹر گاڑیاں نظر پڑیں۔ پتہ چلا کہ یہ حکام مشورے کی غرض سے جامعہ کے کارکنان سے ملنے آئے ہیں۔ پھر رات آگئی۔ جس کا جی چاہا اپنے طور پر راشٹر پتی بھون چل پڑا ورنہ ریڈیو کی رفاقت اختیار کی یا پڑوس میں کسی کے پاس جا بیٹھا۔ میں بھی دس بجے کے قریب گھر سے نکل پڑا۔ اپنے ایک دوست کے پاس پہنچا۔ دہلی سے شائع ہونے والے تمام اخباروں کے مخصوص ضمیمے لیے بیٹھے تھے، انھیں ذرا دیکھا اور گھر لوٹ آیا۔ آخر کار یہ رات گزر ہی گئی۔

صبح آٹھ بجے راشٹر پتی بھون کے لیے لاری روانہ ہوئی۔ اس وقت اوکھلا مارگ پر بہت سے مزدور صفائی کا کام کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ راشٹر پتی بھون میں دربار ہال کے سامنے لوگوں کی قطار لگی ہوئی تھی اس میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ ابھی بھیڑ زیادہ نہ تھی۔ چند ہی منٹ میں ہال کے اندر داخل ہو گئے۔ اس گول ہال کے تقریباً درمیان میں قدِ آدم سے کچھ زائد بلندی پر پھولوں کے انبار میں پھولوں کے شیدائی کا صرف چہرا دکھائی دے رہا تھا۔ چاروں طرف

ایک ایک فوجی افسر احترام پاسبانی میں بے حس وحرکت کھڑا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک رسی بندھی ہوئی تھی تاکہ لوگ سامنے سے گزرتے چلے جائیں۔ دیدارِ میت کرتے ہوئے ہم سب آگے بڑھے۔ دکھے ہوئے تھے دل کچھ اور دکھ کر رہ گئے۔ لیکن ہم سب دوسروں کی طرح ہال سے باہر نکلتے نہیں چلے گئے بلکہ آخری سرے پر آکر الگ کو ہٹ گئے اور میت کے سرہانے کی طرف ہال کی گیلری کے پاس پہنچ گئے جہاں کچھ احباب پہلے سے قرآن خوانی میں مشغول تھے۔ یہیں پر میاں اسحاق کھڑے ملے۔ انھوں نے جب ہاتھ ملایا تو رہا سہا ضبط بھی جاتا رہا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال پایا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میاں اسحاق کہاں کے رہنے والے ہیں اور ان کی داستانِ زندگی کیا ہے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ ذاکر صاحب کو وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے ملازم کی حیثیت سے ملے اور پھر ان ہی کے ہو رہے۔ جب انھوں نے علی گڑھ کو خیرباد کہا تو یہ بھی ان کے ساتھ چلے آئے۔ میں ٹیچرز کالج کے ہوسٹل میں ذاکر صاحب کے مکان کے قریب ہی رہتا ہوں۔ یہ یہاں آتے رہتے ہیں۔ جب کبھی ملاقات ہو جاتی، سلام معاضرہ کرتے۔ انھوں نے جس لگن سے ذاکر صاحب کی خدمت کی ہے۔ اس نے دل میں اُن کی وقعت پیدا کر دی ہے۔ ذاکر صاحب بھی انھیں کچھ کم عزیز نہ رکھتے تھے۔ اُن کی شفقت کا اندازہ اس تازہ بات سے بھی ہوتا ہے کہ میاں اسحاق سے ایک روز فرمایا تھا کہ "جب راشٹرپتی بھون سے ہم لوگ اپنے گھر جامعہ نگر واپس جائیں گے تو ہم تم ساتھ ساتھ ایک جھونپڑی بنا کر رہیں گے اور گھر میں اور سب لوگ۔" بہرحال آج تو یہ بڑے بوڑھے اور دُبلے پتلے میاں اسحاق ایک تصویرِ درد سے زائد کچھ نہ تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں آٹھ نو سال پہلے کا ایک نقشہ پھر گیا۔ اسی ہال میں ذاکر صاحب سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ 'انٹر یونیورسٹی یوتھ فیسٹول' کا موقع تھا۔ میں جامعہ کے طلبہ کے نگراں کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ میرے ایک محترم دوست بھی ساتھ تھے جو اس وقت بھی جامعہ میں استاد تھے جب ذاکر صاحب شیخ الجامعہ تھے۔ اِن دنوں ذاکر صاحب بہار کے گورنر تھے لیکن یہاں تشریف لائے ہوئے تھے، ۔۔۔۔

ہم دونوں کو دیکھ کر فوراً ابھار رہے پاس آئے، طلبہ سے باتیں کیں، ان سے مل کر اظہار مسرت فرمایا اور ان کی خوشی کے لیے ان کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ قریب قریب وہی جگہ تھی جہاں اس وقت ہم لوگ تلاوت کر رہے تھے۔ اس دن یہ ہال آراستہ پیراستہ تھا۔ مگر اب تمام آرائش و زیبائش سے عاری نظر آ رہا تھا۔ صرف درمیان میں شیشے کا جھاڑ باقی رہ گیا تھا۔ رہ رہ کے خیال آتا تھا کہ آج اتنے عرصہ بعد اس ہال میں دوبارہ آنا ہوا مگر افسوس، صد افسوس کس حال میں! تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد یہاں سے واپسی ہوئی۔ جب جامعہ نگر واپس پہنچے تو دیکھا کہ مدرسہ ابتدائی اور جامعہ کالج ہوسٹل کے درمیان والے ٹیلے کو ہموار کیا جا رہا ہے۔ سڑک پر اور ٹیلے کے آس پاس مزدور ہی مزدور ہیں۔ بڑی تیزی کے ساتھ صفائی ستھرائی ہو رہی ہے۔ ٹیلے کے آس پاس بھیڑ سی نظر آئی جس میں بچوں کی تعداد زائد تھی۔ جامعہ میں کل دوپہر سے ہی سب کام کاج بند تھا۔ بچوں کے امتحانات بھی ملتوی ہو گئے تھے۔ مگر مطالعے کی طرف کسی کی طبیعت مائل نہ ہوتی تھی۔ دوڑ دوڑ کر اسی جگہ آتے تھے اور جملہ انتظامات کو تجسس کی نگاہوں سے کچھ دیر تک دیکھ کر لوٹ جاتے تھے۔ بڑوں کو بھی ایک غیر معلوم سی خواہش یہاں کھینچ کر لا رہی تھی۔ راہ گیر لوگ بھی لاری سے اتر کر یہاں تک آئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ جامعہ والوں کے دلوں میں اور گھروں میں حرارت کی کمی تھی۔ لیکن سرکاری انتظامات ہر لمحہ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ شام ہوتے ہوتے اس ٹیلے نے ایک بلند میدان کی شکل اختیار کر لی۔ اور وہاں پر بجلی کا بھی انتظام ہو گیا۔ جامعہ کے لوگ مرد عورت، نئے پرانے استاد اور کارکن راشٹرپتی بھون برابر جاتے آتے رہے۔ کوئی محمد علی ہال میں تلاوت کرنے جا بیٹھا، کوئی خانہ نشین ہو کر رہ گیا۔ کسی نے ذاکر صاحب کی نگارشات یا ان سے متعلق کتابیں پڑھ کر اپنے آپ کو آسودہ کیا۔ کوئی ان کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو ایک اخباروں کے نمائندے بھی گھومتے نظر آئے۔ مرکزی محکمہ اطلاعات کے لوگ بھی تصویریں کھینچتے ہوئے دکھائی دیے۔ اب تو جامعہ ہی ہر ایک کی توجہ کا مرکز نظر آتی تھی خواہ اخبارات ہوں یا ریڈیو۔

اتوار کے باوجود اوکھلے پر سیلانیوں کی بھیڑ نہ تھی۔ انھوں نے بھی آج جامعہ کا رُخ کر رکھا تھا۔ دوپہر کو شیخ الجامعہ صاحب، کھٹمنڈو سے واپس آچکے تھے۔ ہم سب کے لیے اپنے درمیان اُن کی موجودگی استقامت کا موجب تھی۔ کسی طور پھر یہ دن کٹ ہی گیا۔ ایک رات اور گزر گئی اگلے دن کی دوپہر بھی سر پر آگئی۔

جامعہ نگر میں اتنے بڑے پیمانہ پر سرکاری انتظام کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ تین دن کے اندر اوکھلا مارگ کا چولا ہی بدل گیا تھا۔ جامعہ کالج اور مدرسہ ابتدائی کے درمیان نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ دیس کے صدر اور ایک عظیم انسان کو اس کی ابدی قیام گاہ تک پہنچانے کے لیے دیس بدیس کے بڑے بڑے لوگ آ رہے تھے۔ اس لیے جو کچھ نہ ہوتا وہ کم تھا۔ فوجی بندوبست بہت زیادہ تھا۔ لیکن اس وقت پریشانی یہ تھی کہ ہم کہاں جائیں۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ بیشتر طبیعتوں میں غم کے ساتھ ساتھ اب جھنجلاہٹ بھی پیدا ہو گئی تھی۔ بہت سے نازک مزاج اور عالی دماغ ساتھی بھی تین چار بجے شام سے ہی امیرِ کارواں کی آخری منزل کے نواح میں جہاں تک اُن کی رسائی تھی، خاک اور دھول میں زمین پر آبیٹھے تھے۔ خواتین دوپہر ہی سے جامعہ کالج ہوسٹل اور قریب کی دوسری عمارتوں کی چھتوں پر جمع تھیں۔ جو لوگ ذرا دیر سے آئے تھے انھیں یہاں تک بھی آنے نہ دیا گیا تھا۔ وہ اوکھلا مارگ پر ہولی فیملی اسپتال کے قریب آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو چار و ناچار یہ وقت اپنے گھر پر ذکر و فکر میں گذار رہے تھے۔ اس مقام پر جہاں وہ فخرِ روزگار آسودۂ خاک ہونے والا تھا، صرف خاص خاص مدعوئین ہی جا سکتے تھے۔ بہت سے اکابرین تشریف لے بھی آئے تھے۔ ہزاروں کا مجمع اِدھر اُدھر موجود تھا مگر انتشار کہیں نہ تھا۔ اتنے میں مغرب کی نماز کی اذان سنائی دی۔ یہ کسی جامعہ کے نوجوان فرزند کی دل نشیں آواز تھی جس نے کچھ دیر کے لئے ساری فضا کو مسحور سا کر دیا۔ پھر لحد پر قرأت ہونے لگی۔ جن لوگوں کے پاس ٹرانزسٹر تھے، ان سے آس پاس کے لوگ لمحے لمحے بھر کی کیفیت پوچھ رہے تھے۔ اس دوران ایک ساتھ کچھ ہل چل سی ہوئی۔ بہت سے فوجی سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ اور

نمازِ جنازہ کا اعلان ہونے لگا۔ جیسے ہی پہلی تکبیر کی صدا بلند ہوئی، ایک خاموشی سی چھا گئی۔ یہ نماز، اس جگہ سے جہاں لوگ اکٹھا تھے، کچھ ہی فاصلے پر میدان میں ادا کی جا رہی تھی۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں دو مہینے قبل بقرعید کی نماز خود ذاکر صاحبؒ نے ادا کی تھی اور ہم سب کے ساتھ ادا کی تھی۔ ہم نے خود ان کا استقبال کیا تھا اور انھیں اپنی مرضی سے ایک جگہ پر بٹھایا تھا۔ نماز کے بعد آرٹس فیکلٹی کی عمارت میں چند بزرگوں اور دوستوں کی ہمراہی میں ان سے مصافحہ کرنے اور ساتھ بیٹھ کر عید کی خوشی منانے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے پرانے ساتھیوں اور معزز مہمانوں سے باتیں کی تھیں لیکن ہم جیسے چھوٹوں کو بھی کسی طور نظر انداز نہ کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ عید کے موقع پر بھی کسی طور انھوں نے اسی جگہ پر ایک اردو کی درسی کتاب کے بارے میں گفتگو کی تھی جو امریکہ سے حال ہی میں وہاں کے لوگوں کو اردو پڑھانے کے لئے شایع ہوئی تھی۔ بہرحال ہم سب خاک نشین ان کی نظرِ کرم کے خوگر تھے مگر اس وقت تو عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ سارا دن کس مپرسی میں تمام ہوا تھا اور اب اس جگہ سے جہاں ایک طور پر مقید سے تھے، امن و امان کے محافظ نکلنے نہ دیتے تھے جو اس گرفت سے آزاد تھا، کسی طور نماز کے میدان میں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر آج وہ کہاں تھے جن کی نگاہ التفات ہمیں حوصلہ دیتی کہ ہم ان کے پاس پہنچ جائیں یا وہ ہمارے پاس اُٹھ کر آتے۔ لہٰذا اپنے حال پر صبر کرنے کے سوا کوئی چارا نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسی فیکلٹی کے سامنے سے ان کی میّت کو فوجی آداب کے مطابق لے جایا گیا اور پیچھے سے ایک ہجوم آتا دکھائی دیا مگر جو لوگ گھنٹوں سے اپنے محبوب رہنما کی ایک آخری جھلک دیکھنے کی آس لگائے بیٹھے تھے، کچھ بھی نہ دیکھ پائے، تاہم کوئی ہنگامہ برپا نہ ہوا۔ سب ہی دل شکستہ تھے۔

وقت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ گزر جاتا ہے۔ یہ گھڑیاں بھی کٹ ہی گئیں۔ اب اکتیس توپوں کی سلامی نے بتا دیا تھا کہ بھارت رتن کو دھرتی کے سپرد کیا جا چکا ہے۔ الوداعی فوجی بگل بھی بج گیا فاتحہ خوانی کی جا چکی تھی۔ بیرونی ممالک کے عمائدین اور دیس کے اکابرین سب ہی جا چکے تھے۔ فوجی نظام کی گرفت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ ہزاروں کا مجمع کبھی کا چھٹ گیا تھا۔ تاہم اِدھر اُدھر

لوگ نظر آ رہے تھے۔ یہ وہی تھے جنھیں تین دن سے چین نہ آیا تھا اور آج تقریباً سارا دن یوں ہی سرگرداں گزار چکے تھے مگر اب بھی جن کا جی گھر جانے کو نہ چاہتا تھا۔ اسی اثنا میں کچھ لوگ مزارِ رہنما کی طرف بڑھتے ہوئے دکھائی دیے۔ ہم نے بھی قدم بڑھائے۔ مزار پر اگربتیاں سلگ رہی تھیں اور پھول نچھاور تھے۔ ارادتمند مٹی دے رہے تھے۔ ایک پولس افسر کچھ روک تھام کر رہا تھا۔ ہم نے بھی موقع نکال کر مٹی دی، پھر فاتحہ پڑھی اور لوٹ آئے۔ چند دوست ساتھ تھے۔ اب کچھ اطمینان سا محسوس ہونے لگا تھا۔ ساری فضا میں اُس وقت نغمۂ یاس کی ایک دھیمی سی صدا اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔

لوگوں کی آمد و رفت میں پھر کوئی فرق نہیں آیا۔ کوئی رات چڑھے اور کوئی رات ڈھلے گھر سے اُٹھ کر فاتحہ پڑھنے گیا کسی نے بعد نماز فجر اُدھر کا قصد کیا۔ اس وقت سے یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ ہر طرح کے لوگ آتے رہتے ہیں۔ اور اپنے اپنے طور پر اظہار عقیدت کرتے ہیں۔ کوئی فاتحہ پڑھتا ہے، کوئی نمسکار کرتا ہے۔ کوئی نہایت ادب کے ساتھ صرف چند منٹ خاموش کھڑا ہو کر لوٹ جاتا ہے اور کوئی عقیدت و محبت کے آنسو نذر کرتا ہے۔ کوئی پھول چڑھاتا ہے اور کوئی پیسے۔ اس جگہ پر پہلے کوئی پاؤں نہ رکھتا تھا۔ ایک ٹیلہ سا تھا اور کچھ ناہموار زمین۔ اب ایک کشادہ میدان نکل آیا ہے جس کے تقریباً وسط میں مزار ہے۔ اب اس کے اوپر شامیانہ لگا ہوا ہے اور مزار کے اردگرد تقریباً دو فٹ اونچی ایک چہار دیواری بنا دی گئی ہے۔ روشنی کا معقول انتظام ہے اور آس پاس مختلف پھولوں اور خوشنما پودوں کے گملے رکھ دیے گئے ہیں۔ مزار ہر وقت پھولوں سے ڈھکا ہوا ملتا ہے۔ قرب میں ہی جامعہ کی گلاب باڑی ہے اور سرہانے کی طرف ذرا ہٹ کر جامعہ کی مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے۔ جب بھی وہاں جائیے، کچھ نہ کچھ لوگ ضرور ملتے ہیں کیونکہ اب یہ کوئی معمولی قطعہ زمین نہیں رہا ہے بلکہ اس کے قلب میں ایک انسان سویا ہوا ہے جس کا دل محبت کے شرر سے سراپا نور تھا، جس میں اندازِ خسروانہ بھی تھے اور شانِ فقیرانہ بھی۔ جو رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے رہ سکتا تھا مگر قلندر بن کر رہا۔ جسے سادگی، سچائی اور نیکی کی راہ سے نہ مخالفت ہٹا سکی، نہ شہرت، نہ عظمت

اور نہ دولت۔ جس کے بارے میں بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کے ہر دور میں "قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اُس کی"۔ وہ تو ایک بندۂ مومن تھا جو مصاف زندگی میں فولاد بن جاتا تھا اور شبستان محبت میں حریر و پرنیاں۔

آج ساری جامعہ ذاکر صاحب کی یادگار ہے۔ اس کے چپّے چپّے پر ان کے نقشِ قدم موجود ہیں۔ یہاں ان کے مزاج داں اور ادا شناس بستے ہیں۔ ان کے حوصلوں کے امین بھی رہتے ہیں اور ان کی میراث کے محافظ بھی۔ بہت سے وہ سینے ملیں گے جہاں ان کے افکار و خیالات کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ اس وقت رہ رہ کر بارہ تیرہ برس پہلے کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ یہاں آئے ہوئے تقریباً تین سال ہو گئے تھے۔ ایک شام کو ذاکر صاحب اپنے گھر اور ہمارے کالج کے درمیان چہل قدمی فرما رہے تھے۔ میرا بھی ادھر سے گزر ہوا۔ انھیں دیکھ کر ٹھٹک سا گیا مگر وہ خود ہی بڑھ کر پاس آ گئے۔ "آپ کیا مضامین پڑھا رہے ہیں؟ آج کل کیا خاص کام کر رہے ہیں؟ آپ کے خیال میں کونسے کام اہم ہیں؟" انھوں نے چند ایسے ہی سوال کر ڈالے۔ میں نے اپنے نوآموز پن میں کچھ دراز نفسی دکھائی۔ فرمانے لگے "بھئی، ہمارا دیس بہت بڑا ہے۔ اُس کے مسائل بھی اسی اعتبار سے بڑے ہیں۔ لیکن بڑے بڑے لوگ بھی موجود ہیں۔ بڑے کام، بڑوں کے لیے چھوڑ دیجئے۔ ہمیں اور آپ کو جامعہ میں چھوٹے چھوٹے کام کرنے چاہئیں۔ ہم چھوٹے ہیں۔ آپ چھوٹا سا کام سوچیے۔ بس، چھوٹا سا کام کیجئے۔" ان کی یہ بات اَب جس قدر سوچتا ہوں، اس کی معنویت کا احساس بڑھتا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے اپنے آپ سے ندامت۔

آج شومئ قسمت سے "متاعِ کارواں" جاتا رہا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ احساسِ زیاں نہ ہو۔!

عبداللطیف اعظمی

ڈاکٹر ذاکر حسین ـــــ اہم تاریخیں

(ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا اصل وطن یو پی کے ایک ضلع فرخ آباد کا ایک قصبہ قائم گنج ہے، جسے "محمد شاہ کے زمانے میں، محمد خاں بنگش نے اپنے بیٹے قائم خاں کے نام پر آباد کیا تھا۔ اس نئی بستی میں سرحد سے آفریدیوں کو بلا کر بسایا گیا۔ ذاکر صاحب کے مورث اعلیٰ حسین خاں جو مدہ آخون (بڑے استاد) کے لقب سے مشہور تھے، اسی زمانے میں ہندوستان آئے، عمر بھر درس و تدریس ان کا مشغلہ رہا، وہ عالم کے ساتھ صوفی باصفا تھے۔ حسین خاں کے بعد تین پشت تک سپہ گری کا پیشہ ذریعۂ معاش رہا۔ ذاکر صاحب کے دادا غلام حسین خاں نے حیدر آباد کنٹجنٹ میں ملازمت اختیار کی، وہاں سے پنشن لی تو قائم گنج آگئے اور کاشتکاری اور باغات لگانے میں وقت گذارنے لگے۔ ذاکر صاحب کے والد فدا حسین خاں ۱۸۸۸ء میں تلاش روزگار میں حیدر آباد چلے گئے اس وقت ان کی عمر یہی بیس سال کی تھی۔ یہاں انھوں نے مراد آبادی برتنوں کی تجارت شروع کی پھر بعض دوستوں کے مشورے پر وکالت کا امتحان دیا تو اول درجے میں کامیاب ہوگئے۔ اب انھوں نے تجارت چھوڑ، وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور اورنگ آباد میں دفتر کھول لیا، خدا نے ان کے کام میں برکت دی۔ اورنگ آباد ہی میں انھوں نے "آئین دکن" نام کا قانونی رسالہ جاری کیا، جس میں حیدر آباد ہائی کورٹ کے نظائر شائع ہوتے تھے۔ "آئین دکن" کی اشاعت سے ان کی شہرت حیدر آباد تک پہنچ گئی۔ اس پر وہ ۱۸۹۲ء میں حیدر آباد

چلے آئے۔")

۱۸۹۷ ذاکر صاحب حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ صحیح تاریخ اور مہینہ معلوم نہیں محض اندازے سے ۸ر فروری طے کی گئی ہے۔

۱۹۰۷ اٹاوہ (یوپی) کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔

۱۹۱۳ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ایم اے او کالج علی گڑھ میں انٹرمیجیٹ (سائنس) میں داخلہ لیا۔

۱۹۱۵ کرسچین کالج لکھنؤ میں بی ایس سی میں داخلہ لیا، مگر بیماری کی وجہ سے امتحان نہیں دے سکے اور علی گڑھ واپس آ گئے۔

۱۹۱۸ ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۱۹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے (پہلے سال) کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۲۰ تحریک ترک موالات کے سلسلے میں ۲۹ر اکتوبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی۔ اس کے قیام میں ذاکر صاحب پیش پیش تھے اس لیے اس کو کامیاب بنانے میں دل و جان سے لگ گئے۔

۱۹۲۲ بی اے کرنے کے بعد پروفیسر ایڈون کینن کی کتاب "ایلی منٹری پولٹیکل اکانومی" کا ترجمہ کیا تھا اس سال یہ ترجمہ "مبادی معاشیات" کے نام سے شائع ہوا۔ اسی سال ذاکر صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے برلن (جرمنی) تشریف لے گئے۔

۱۹۲۵ برلن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا امتحان پاس کیا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا: "ہندوستان کی معیشت دیہی کا نظام"۔

۱۹۲۶ جرمنی سے واپس آئے اور جامعہ میں کام شروع کر دیا، اپنے ساتھ ڈاکٹر سید

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کے مضمون کے، جو نذر ذاکر میں شائع ہوا ہے، ابتدائی حصے کی تلخیص ہے۔

عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب کو بھی لائے۔ آنے کے ساتھ ہی شیخ الجامعہ کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔

۱۹۳۲ افلاطون کی مشہور کتاب "اسٹیٹ" کا ترجمہ ذاکر صاحب نے ایم اے کی طالب علمی کے زمانے میں شروع کیا تھا، "ریاست" کے نام سے یہ ترجمہ اس سال شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی کے بعد ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

اسی سال ۵،۶،۷ مارچ کو ہندوستانی اکیڈیمی یو پی (الہ آباد) کی دعوت پر مقالہ پڑھا، جو "معاشیات — مقصد اور منہاج" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔

۱۹۳۷ گاندھی جی نے وردھا میں ایک تعلیمی کانفرنس بلائی، ابتدائی کاروائی کے بعد اسکیم اور نصاب تعلیم مرتب کرنے کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی، ذاکر صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۹۴۳ ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبوں اور ریڈیو کی تقریروں کا مجموعہ "تعلیمی خطبات" کے نام سے مارچ میں شائع ہوا۔

۱۹۴۴ دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مورس گائر کی دعوت پر "کیپٹلزم" کے عنوان سے دس لکچر دئے، جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئے، ۶۷ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

۱۹۴۶ مشہور جرمن مصنف فریڈرش لسٹ کی ایک کتاب کا ذاکر صاحب نے بہت پہلے ترجمہ کیا تھا جو اس وقت تک شائع نہیں ہو سکا تھا، اس سال اپریل میں "معاشیات قومی" کے نام سے شائع ہوا۔

۱۹۴۸ مولانا آزاد کے اصرار پر مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی ذمہ داریاں قبول کیں۔ ۲۸ نومبر کے کورٹ کے جلسے میں نواب اسمٰعیل خاں (وائس چانسلر) نے ذاکر صاحب کا نام تجویز کیا جو بالاتفاق منظور ہوا۔

۱۹۵۱ یو پی کے وزیر تعلیم کی خدمت میں صرف لکھنؤ کے ۱۰ ہزار شہریوں کے دستخطوں سے ایک درخواست پیش کی، جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان کے بچوں کے لئے ان کی مادری زبان اردو میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ۲۹ نومبر کو چھ سال کے لئے (نئے قاعدے کے مطابق) دوبارہ وائس چانسلر منتخب ہوئے۔

۱۹۵۲ جولائی میں جب وہ امریکا کے دورے پر تھے، راجیہ سبھا کے ممبر نامزد کیے گئے، اور ۱۱ر اگست کو حلف لیا۔

۱۹۵۴ انجمن ترقی اردو کے صدر کی حیثیت سے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں یوپی کے دو لاکھ بالغ شہریوں کے دستخطوں سے ایک درخواست پیش کی، جس میں مانگ کی گئی تھی کہ اردو کو دوسری علاقائی زبان کی حیثیت سے منظور کیا جائے۔ اس سال ۱۵ر اگست کو پدم وبھوشن کا خطاب ملا۔ ۱۵ر دسمبر کو یونسکو کی طرف سے عرب ممالک میں بنیادی تعلیم کو روشناس کرانے کیلئے قاہرہ کیلئے روانہ ہوئے۔

۱۹۵۶ راجیہ سبھا کے دوبارہ ممبر نامزد کیے گئے اور ۲۶ر اپریل کو حلف لیا۔ اسی سال مئی میں شاہ ابن سعود کی دعوت پر سعودی عرب کا پندرہ روزہ دورہ کیا۔

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی میعاد کے پورے ہونے میں ابھی کوئی سوا سال باقی تھا کہ استعفا دے دیا۔ بڑے پس وپیش کے بعد ۱۵ر ستمبر سے منظور کیا گیا۔ علی گڑھ سے علیحدہ ہونے کے بعد جامعہ نگر واپس آئے تو امید تھی کہ اب کچھ دن آرام وسکون ملے گا، جس کی ان کو بڑی ضرورت تھی، مگر یہاں آتے ہی مولانا آزاد نے یونسکو کے اجلاس کے لئے جو اسی سال دلّی میں منعقد ہونے والا تھا، حکومت کا نمائندہ مقرر کر دیا۔ اس اجلاس میں یونسکو نے انھیں اپنے اکزکیٹو بورڈ کا رکن منتخب کیا اور اس سلسلے میں انھیں یورپ جانا پڑا۔ اسی زمانے میں وہ علاج کے لئے جرمنی گئے ہوئے تھے کہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا پیغام ملا کہ وہ بہار کی گورنری کے لیے ان کا نام تجویز کر رہے ہیں، براہ کرم انکار نہ کریں۔

۱۹۵۷ جولائی میں بہار کے گورنر مقرر ہوئے۔

۱۹۵۸ ۱۲ر ۱۳ر ۱۴ر دسمبر کو سردار ولبھ بھائی پٹیل کے یادگار لکچر کے سلسلے میں Education Reconstruction In India کے نام سے انگریزی میں لکچر دئے جو ستمبر ۱۹۵۹ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے اور جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین کے قلم سے مئی ۱۹۶۲ء میں "ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم" کے نام سے شائع ہوا۔

۱۹۶۲ مئی میں نائب صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔ اس سال ملک کا سب سے بڑا خطاب بھارت رتن ملا۔

۱۹۶۳ ذاکر صاحب کی مختلف کہانیوں کا مجموعہ "ابو خاں کی بکری اور چودہ اور کہانیاں" کے نام سے شائع ہوا۔

۱۹۶۴ صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا، اس لئے دستور ہند کی دفعہ ۶۵ (۲) کے مطابق قائم مقام کی حیثیت سے صدر جمہوریہ کے فرائض انجام دئے۔ اسی زمانے میں پارلیمنٹ کے اجلاس کو بھی خطاب کیا۔

۱۹۶۵ ۲۱ر فروری کو دارالمصنفین (شبلی اکیڈیمی) اعظم گڑھ کی گولڈن جوبلی کا جلسہ منعقد ہوا، جس کی ذاکر صاحب نے صدارت کی اور حکومت کی طرف سے پچاس ہزار کی گراں قدر امداد کا اعلان کیا۔

صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن لندن تشریف لے گئے اور ذاکر صاحب نے قائم مقام صدر جمہوریہ کی حیثیت سے ۱۷ر مارچ کو حلف لیا۔

ذاکر صاحب نے انگریزی میں جو تعلیمی خطبے دئے ہیں، ان کا ایک مجموعہ THE DYNAMIC UNIVERSITY کے نام سے شائع ہوا۔

۱۹۶۷ ۲۹ر اپریل کو امریکا کی مشی گن یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری دی۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا، جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ وہاں سے ہندوستان واپس آئے تو صدر جمہوریہ کے انتخاب کی گہما گہمی تھی، الکشن سے صرف تین روز پہلے واپس آئے، گویا یہاں جب جوڑ توڑ ہو رہا تھا تو ذاکر صاحب ہندوستان سے باہر تھے۔ ۹ر مئی کو نتیجے کا اعلان ہوا کہ ذاکر صاحب بہت بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔

۱۹۶۹ ۳ر مئی کو یکایک دل کا شدید دورہ پڑنے کی وجہ سے دن کو گیارہ بجکر بیس منٹ پر انتقال فرمایا اور ۵ر مئی کو بعد مغرب کوئی آٹھ بجے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں، جس کی انھوں نے اپنے خون پسینہ سے آبیاری کی تھی، پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کئے گئے۔

کوائف جامعہ

امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی وفات

امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (صدر جمہوریہ ہند) کے انتقال کی اطلاع دس پندرہ منٹ کے اندر جامعہ میں ہوگئی، یہ اطلاع اتنی غیر متوقع اور حادثہ اتنا سخت تھا کہ ہر شخص مبہوت ہوکر رہ گیا۔

جس دن یہ حادثہ پیش آیا، مرحوم کے جگری ساتھی اور جامعہ کے شیخ پروفیسر محمد مجیب صاحب کٹھمنڈو میں تھے۔ کٹھمنڈو (نیپال) میں کونگریس کی کانفرنس تھی اور اس میں شرکت کے لیے مجیب صاحب ۲۹ر اپریل کو روانہ ہوئے تھے، وہاں سے ۳ر مئی کو صبح کے وقت واپس آنا تھا اور ہوائی اڈے سے ہی بنگلور روانہ ہونا تھا، جہاں ریزرو بنک کے ڈائرکٹروں کی میٹنگ میں شرکت کرنی تھی۔ حادثے کی خبر ملی تو جامعہ کے ذمہ دار حضرات نے ان کو اطلاع کرنے کی کوشش کی، مگر ٹیلیفون کی لائن خراب تھی، کوئی اور صورت بھی پیدا نہ ہوسکی۔ مجیب صاحب کو کوئی پانچ بجے شام کو اطلاع ملی۔ انھوں نے بھی پہلے ٹیلیفون کرنے کی کوشش کی اور جب کامیابی نہیں ہوئی تو دو تین تار دے۔ انھیں سب سے زیادہ فکر قبر کی جگہ کی تھی، وہ چاہتے تھے کہ جامعہ میں دفن کیا جائے اور اس جگہ کیا جائے جسے انھوں نے بہت پہلے پسند کیا تھا، مگر خوش قسمتی سے مسجل صاحب سے ذکر کر دیا تھا، اس لیے جب راشٹرپتی بھون میں اس مسئلے پر گفتگو آئی تو انھوں نے مجیب صاحب کی خواہش کا ذکر کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے عزیزوں کی بھی یہی خواہش تھی کہ مرحوم کی آخری آرام گاہ جامعہ نگر میں ہو، اس لیے ان لوگوں نے بھی اس خیال کی تائید کی اور قبر

کے لیے جو جگہ تجویز کی گئی تھی، وہ جامعہ نگر میں سب سے اچھی تھی اس لیے حکومت نے بھی اسے پسند کیا۔

دوسرے روز یعنی ۴ مئی کی صبح کو مجیب صاحب کٹھمنڈو سے واپس آئے تو بنگلور کا سفر ملتوی کر دیا اور ہوائی اڈے سے سیدھے راشٹرپتی بھون گئے۔ انھیں اپنے جذبات پر بڑا قابو ہے، شدید سے شدید حادثوں کے موقعوں پر میں نے دیکھا ہے کہ انھوں نے بڑے ضبط اور تحمل سے کام لیا ہے، مگر یہ حادثہ پچھلے تمام حادثوں سے بڑا اور شدید تھا، اس لیے دربار ہال میں، جہاں ان کے ساتھی اور رہنما کی میت رکھی ہوئی تھی، داخل ہوئے تو غم واندوہ کا سیلاب امڈ آیا اور جذبات بے قابو ہو گئے، چند منٹ ٹھہر کر اور اپنے محبوب ساتھی کے لیے مغفرت کی دعا کر کے خورشید عالم صاحب کی رہنمائی میں زنان خانے کی طرف روانہ ہوئے۔ آدھے راستے میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی مل گئیں، ذرا رک کر مجیب صاحب سے قبر وغیرہ کے انتظامات کے بارے میں پوچھا اور جب معلوم ہوا کہ وہ ابھی نیپال سے چلے آرہے ہیں تو آگے بڑھ گئیں۔ مجیب صاحب کے ساتھ میں، ضیاء صاحب اور ابوسالم صاحب بھی تھے، مجیب صاحب اور مسز اندرا گاندھی، بیگم صاحبہ اور دونوں صاحبزادیوں، سعیدہ اور صفیہ سے ملنے اندر چلی گئیں اور ہم لوگ ڈیوڑھی پر ہی رک گئے۔ وہاں دوسرے قریبی اعزا مثلاً ڈاکٹر مسعود حسین خاں، غلام ربانی تاباں وغیرہ ملول اور نڈھال بیٹھے ہوئے تھے، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب دربار ہال میں قرآن خوانی میں مشغول تھے اور ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب اس وقت تک آئے نہیں تھے۔

وہاں سے مجیب صاحب جامعہ آئے تو سب سے پہلے اس جگہ گئے، جو قبر کے لئے تجویز کی گئی تھی اور جہاں سیکڑوں مزدور کام میں لگے ہوئے تھے۔ ریڈیو پل پل کی خبریں نشر کر رہا تھا اس نے اطلاع دی کہ مجیب صاحب آگئے ہیں تو نامہ نگاروں اور ریڈیو اور ٹیلیویژن کے نمائندوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور انھیں ذرا سا دم لینے کو بھی موقع نہیں ملا۔ راشٹرپتی بھون میں جب ریڈیو کے ایک نمائندے نے مجیب صاحب کا ردعمل یا خراج عقیدت ٹیپ ریکارڈ کرنے کی کوشش کی تھی، تو انھوں نے

سختی سے انکار کر دیا تھا، مگر ایک صاحب گھر پر آموجود ہوئے تو اب انکار کرنا مشکل تھا۔ بہت تامل اور لیں و پیش کے بعد ٹیپ ریکارڈ کرنے کے لیے جو بیان دیا۔ وہ تھوڑی ہی دیر کے بعد نشر کیا گیا۔ مرحوم کے بارے میں مجیب صاحب کا یہ پہلا اور برجستہ بیان ہے، اس لیے ذیل میں پیش کرتا ہوں:

"ذاکر صاحب سے ۱۹۲۲ میں جرمنی میں ملاقات ہوئی تھی اس وقت سے ان کا ساتھ رہا۔ لیکن آج بھی پوچھیئے تو بہت سی باتیں ہیں جن کے بارے میں میں یقین کے ساتھ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ان کی طبیعت میں ایسی گہرائیاں تھیں جن تک میری رسائی ہوئی۔ کسی اور کی۔ مثلاً میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اپنی زندگی میں انھوں نے کتنے دکھ سہے، اس لئے کہ ان کا کام تھا دوسروں کی ہمت بڑھانا، اور یہ کام ہمت ہار کر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے غم کو، اپنی تکلیف کو، اس طرح چھپاتے کہ کبھی دوسرے کو کچھ محسوس نہ ہوتا۔ اسی طرح وہ اپنے حوصلوں کو کبھی اس طرح بیان نہ کرتے کہ کوئی کہہ سکتا کہ وہ اتنا چاہتے ہیں اور بس۔ کئی برس تک میری ذمہ داری تھی کہ ان کے حوصلوں کو پورا کرنے میں مدد کروں، لیکن اب بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ ان کے کتنے حوصلے پورے ہوئے۔ راشٹرپتی بن گئے تب بھی معلوم ہوتا تھا کہ ان کا سب سے بڑا حوصلہ یہ ہے کہ گلابوں میں نیا رنگ، بوگین ویلیا کے دریعے نئی رونق پیدا کریں، ان کو دولت اور اختیار اور حیثیت سب حق کے طور پر ملے۔ خود شاید وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسے انسان بنیں جو سورج کی طرح آپ اپنی دلیل ہو، روشنی پھیلائے، جان پیدا کرے اور آنکھوں کو حسن کے منظر دکھائے۔"

معین الدین حارث صاحب کا جامعہ سے جو گہرا تعلق ہے، اس کے بارے میں پچھلے شمارہ میں لکھ چکا ہوں۔ ذاکر صاحب اور مجیب صاحب سے ان کو خاص لگاؤ اور بڑی عقیدت ہے۔ انھیں اس حادثے کی اطلاع ملی تو گرتے پڑتے دلی پہنچے اور سیدھے راشٹرپتی بھون پہنچے۔ اس سے پہلے وہ بارہا ڈاکٹر صاحب کے مہمان کی حیثیت سے وہاں ٹھہر چکے تھے، مگر آج کے قیام اور پچھلے قیام میں بڑا فرق تھا، میں ان کو لینے کے لئے اسٹیشن گیا تھا اور شیخ الجامعہ صاحب کی ہدایت تھی کہ میں انھیں جامعہ لاؤں، انھیں معلوم تھا کہ راشٹرپتی بھون کا قیام ان کے لیے

کتنا تکلیف دہ ہوگا، تدفین میں ابھی پورے ۴۸ گھنٹے باقی تھے۔ ان ۴۸ گھنٹوں میں ایک منٹ بھی ان کو وہاں چین نہیں ملے گا، مگر وہ اصرار کر کے وہیں ٹھہرے، زندگی بس وہیں ٹھہرا کرنے تھے تو اب وہاں نہ ٹھہرنا بے وفائی ہوگی، وہ نہیں رہے نہ سہی، ان کا جسدِ خاکی تو ہے، جب تک وہ ہے اسی کے پاس رہیں گے، راستے بھر ـــ بمبئی سے دہلی تک ـــ تلاوت کرتے آئے تھے، اب مرحوم کے سرہانے بیٹھ کر کریں گے۔ اس کے لیے جو بھی وقت مل جائے غنیمت ہے۔ دیدار کا یہ آخری وقت تھا، ۴۸ گھنٹے کے ایک ایک منٹ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید صاحب، سپلا کمپنی (بمبئی) کے بانی اور ڈائرکٹر بھی مرحوم کے مخصوص دوستوں اور جامعہ کے چند ممتاز ہمدردوں میں سے ہیں۔ مولانا محمد علی نے شروع میں جامعہ کے لئے چند اساتذہ کا تقرر کیا تھا، ان میں خواجہ صاحب بھی تھے۔ کیمسٹری کی تعلیم ان کے سپرد کی گئی تھی۔ جامعہ پر جب کبھی کڑا وقت آیا۔ انھوں نے دل کھول کر مدد کی، ہمدردانِ جامعہ کی کامیابی میں ان کی خدمات کو بڑا دخل رہا ہے، ۱۹۴۲ء کی جوبلی کے لئے بمبئی سے سرمایہ حاصل کرنے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو جو شاندار کامیابی ہوئی، اس کا سہرا تمام تر خواجہ صاحب کے سر ہے۔ ان کے بڑے بھائی عبدالمجید خواجہ صاحب شیخ الجامعہ اور امیر جامعہ رہ چکے ہیں، مرحوم ذاکر صاحب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نے بہت کوشش کی کہ اپنی زندگی ہی میں ذاکر صاحب کو اپنی جگہ پر امیر جامعہ مقرر کرا دیں مگر ذاکر صاحب کسی طرح تیار نہیں ہوئے اور انھیں امیر جامعہ کے فرائض انجام دینے پر اصرار کیا۔ ۲ دسمبر ۱۹۶۲ء کو ان کا انتقال ہوا تو ذاکر صاحب امیر جامعہ مقرر ہوئے، مگر خواجہ عبدالحمید صاحب کا جامعہ اور ذاکر صاحب سے تعلق اپنے بڑے بھائی کی وجہ سے نہیں تھا، انھیں بذاتِ خود جامعہ سے گہری وابستگی تھی اور ذاکر صاحب سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی اور یہ محبت اور عقیدت امتدادِ زمانے کے ساتھ بڑھتی رہی۔ ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو موصوف کی ۷۰ ویں سالگرہ منائی گئی تو ذاکر صاحب نے اس میں شرکت کی اور دل کھول کر ان کی خدمات کو سراہا اور ان کی دوستی کا ذکر

ایسے الفاظ میں کیا جو ذاکر صاحب ہی کے لیے ممکن ہے ۔

خواجہ صاحب کو ایسے مخلص اور عظیم دوست کے بچھڑ جانے پر جو بھی غم ہوا ہو کم ہے ۔ وہ دلی آئے تو قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے دفتر میں تشریف لائے ، ان کی جرمن اہلیہ بھی ساتھ تھیں ۔ مجیب صاحب اس وقت ہمایوں کبیر صاحب سے فون پر بات کر رہے تھے ، مجیب صاحب سے آنکھیں چار ہوتے ہی بے قابو ہو گئے اور بری طرح رونے لگے ، میں عرض کر چکا ہوں کہ مجیب صاحب ہمیشہ انتہائی ضبط سے کام لیتے ہیں ، مگر ظاہر ہے اس صورت حال میں ان کا ضبط قائم نہیں رہ سکتا تھا ۔ بعد میں جب ذاکر صاحب کی یادگار کے قیام کا ذکر آیا اور مجیب صاحب نے مختلف منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے ذاکر حسین اسکالرشپ کے قیام کا خیال ظاہر کیا تو انھوں نے فوراً فرمایا کہ اس سلسلے میں میں زیادہ سے زیادہ مدد کرنے کے لئے تیار ہوں ۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں میں ذکر کر دوں کہ چند سال پیشتر جب جامعہ نے اپنے بہترین طالب علم کو ایک ہزار کا جواہر لال نہرو انعام دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لیے شیخ الجامعہ صاحب نے رقم کی اپیل کی تھی تو خواجہ صاحب نے فوراً اس اپیل پر لبیک کہا اور اُس وقت سے ایک ہزار کی یہ رقم وہ پابندی کے ساتھ دے رہے ہیں ۔

صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ، منیجر اور رفیق دار المصنفین ، ذاکر صاحب کے انتقال سے ایک دو روز پہلے دہلی تشریف لائے ۔ مرحوم کا دار المصنفین سے ہمیشہ سے گہرا تعلق رہا ہے ، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اور مولانا مسعود علی ندوی مرحوم جب کبھی دہلی آتے تو عام طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے یہاں ٹھہرتے اور ان سے بہت سے معاملات میں مشورہ لیتے اور جامعہ کے بارے میں مشورے دیتے ۔ دار المصنفین سے یہ تعلق بعد میں اور بڑھ گیا اور دار المصنفین نے ۱۹۶۵ء میں اپنی گولڈن جوبلی منائی تو صدارت کے لئے ذاکر صاحب کو دعوت دی اور انھوں نے خوشی سے منظور کی ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس جلسے میں حکومت کی طرف سے پچاس ہزار کی گراں قدر رقم کی امداد کا اعلان فرمایا ۔ مرحوم کے اشارے اور کوشش سے دار المصنفین کو حکومت کی

اور بھی امدادیں ملی ہیں، غرض بہت سے اداروں کی طرح دار المصنفین کے لیے بھی مرحوم کی ذات آڑے وقتوں میں بروقت سہارا ثابت ہوتی تھی۔ صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے اعظم گڈھ ہی سے ملاقات کے لیے لکھدیا تھا اور مجھے لکھا تھا کہ ان کے سکریٹری کو فون کر کے کوئی وقت طے کرا دوں۔ مگر قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا، ان کی ملاقات ہوئی مگر ذاکر صاحب سے نہیں ان کے جسد خاکی سے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ نماز جنازہ میں دار المصنفین کی نمایندگی ہوگئی جو دوسری صورت میں شاید ممکن نہ ہوتی۔ واپسی سے قبل فاتحہ اور احباب جامعہ سے ملنے آئے، ان کے ساتھ ان کے میزبان امیر جماعت اسلامی مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی بھی تشریف لائے تھے۔ مولانا ابو اللیث صاحب نے راشٹرپتی بھون کی قرآن خوانی میں بھی سرگرمی کے ساتھ شرکت کی تھی۔ یہاں فاتحہ کے لئے آئے تو تعزیت کے لیے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر اتفاق سے وہ اس وقت جامعہ میں نہیں تھے۔

پروفیسر محمد عاقل صاحب انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حیاتی رکن ہیں۔ ایک طویل عرصے تک جامعہ میں معاشیات کے پروفیسر کی حیثیت سے پڑھا چکے ہیں اور رسالہ جامعہ کے اڈیٹر بھی رہ چکے ہیں، آج کل اپنے وطن سہارنپور میں رہتے ہیں۔ انھوں نے ریڈیو پر ذاکر صاحب کے حادثہ کی اطلاع سنی تو افتاں وخیزاں جامعہ پہنچے اور جامعہ برادری کے غم میں جو ان کا اپنا بھی غم تھا شریک رہے ۔۔۔ ڈاکٹر سید منیر الدین قادری صاحب ۱۹۲۶ء میں جامعہ کے مدرسہ ابتدائی میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں آج کل نیوزی لینڈ میں (؟) مقیم ہیں۔ وہ رات کا کھانا کھا رہے تھے (اپنے وقت کے لحاظ سے دوپہر تھی) کہ بی بی سی کی خبروں میں ڈاکٹر صاحب کی وفات کی خبر سنی، کھانا چھوڑ دیا اور جو جہاز انھیں مل سکا، اس سے ہندوستان کے لئے روانہ ہوگئے اور نماز جنازہ میں شرکت کیلئے ٹھیک وقت پہنچ گئے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین (؟) ڈاکٹر سید عبدالعلیم صاحب، عین وقت پر چوٹ آجانے کی وجہ سے نماز جنازہ میں شریک نہیں ہو سکے، مگر جناب نواب صاحب چھتاری (پرو چانسلر مسلم یونیورسٹی)، پروفیسر آل احمد سرور صاحب، پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب، پروفیسر شبیر حسن خاں صاحب اور پروفیسر ابرار مصطفیٰ خاں صاحب یونیورسٹی کی طرف سے تشریف لائے اور تدفین میں بھی شرکت کی۔

اس موقع پر تعزیت کے بے شمار خطوط موصول ہوئے، جن میں بعض ایسے ہیں جن کے اقتباسات دینے کو جی چاہتا تھا، مثلاً راولپنڈی سے پروفیسر محمد سرور صاحب کا، لاہور سے سید مطلبی فرید آبادی صاحب کا، علی گڑھ سے ریاض الرحمٰن شروانی صاحب کا، بنج گنج سے شکیل بدایونی صاحب کا، چائلڈ گارڈنس اسکول دہلی کے پرنسپل سردار جگت سنگھ صاحب کا، اعظم گڈھ سے جامعہ کے ایک قدیم طالب علم عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی کا، ایسے ہی اور بہت سے خطوط ہیں مگر گنجائش کی کمی کی وجہ سے افسوس ہے کہ ہم ان کے مختصر اقتباسات بھی دینے سے قاصر ہیں۔

(عبداللطیف اعظمی)

تعزیتی جلسہ

۱۰ مئی کو انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ (کورٹ) کا جلسہ ہونے والا تھا اور اس کی بعض تقریبات میں امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے شرکت کا وعدہ فرمایا تھا۔ یہ جلسہ اپنے مقررہ وقت پر منعقد ہوا اور اس کے بعد ایک عام تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں جامعہ کے علاوہ معززین شہر نے بھی شرکت کی۔

تلاوت قرآن کے بعد برکت علی فراق صاحب نے ایک مضمون پڑھا، پنجابی کی مشہور شاعرہ امریتا پریتم صاحبہ نے اپنی نظم سنائی، جسے موصوفہ سیوم کے موقع پر مرحوم کی قبر پر پھولوں کے انبار میں رکھ گئی تھیں، ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے عبدالغفار مدہولی صاحب اور خلیل شرف الدین صاحب کے خطوط پڑھے۔ اس کے بعد صدر جلسہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اپنا مضمون پڑھا، پھر استاد موسیقی بلال احمد صاحب نے مولانا رومؒ کی مثنوی کے چند منتخب شعر بڑے پرسوز لہجے میں پڑھکر سنائے، آخر میں مسجل جامعہ شعیب الرحمٰن صاحب نے تعزیتی قرار داد پڑھ کر سنائی جسے دو منٹ کھڑے ہوکر جلسے نے منظور کیا۔ قومی ترانے کے بعد جلسہ انتہائی خاموشی کے ساتھ برخاست ہوا۔ تعزیتی تجویز ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"جامعہ ملیہ کے استادوں، کارکنوں، طالب علموں اور آس پاس کی بستیوں کے باسیوں کا یہ جلسہ اپنے مربی، محسن اور محبوب رہنما ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی اچانک وفات پر اپنے گہرے رنج و الم اور شدید روحانی کرب و اضطراب کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم ہمارے لئے کیا تھے، اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آسمان برسوں گردش میں رہتا ہے، زندگی ہزاروں کروٹیں لیتی ہے تب کہیں جاکر بزم امکاں سے وہ دانائے راز پیدا ہوتا ہے جو ایک پوری جماعت پوری قوم کی تقدیر بن جاتا ہے۔ ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت کا نور، بلا لحاظ این و آں، سب کی راہوں کو منور رکھتا تھا۔ حیات قومی کا وہ کون سا گوشہ ہے اور علم و تہذیب،

ادب اور فن کے وہ کون سے خدمت گذار ہیں جو ان کے قریب آئے اور فیضیاب نہیں ہوئے۔ ان کی زندگی کا شعوری سفر آج سے لگ بھگ پچاس برس پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام سے شروع ہوا۔ اس ادارہ کو بنانے، زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لئے انھوں نے ...... کون سی ایسی صعوبت تھی جو برداشت نہیں کی۔ لیکن انھوں نے ہر صعوبت کو، بے سروسامانی کی ہر صورت کو اپنے حوصلے اور ہمت کی ایک خوش آیند آزمائش تصور کیا اور ایسی ہر منزل میں، اور یہ منزلیں طویل اور بہت کٹھن ہوتی تھیں، ان کی آتش شوق اور تیز ہوئی۔ انھیں دیکھ کر ان کے ساتھیوں کی ہمتیں بڑھتی تھیں اور وہ اور زیادہ تن دہی، انہماک اور لگن کے ساتھ باغبانی صحرا کے آئین مرتب کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

جامعہ ملیہ قائم رہی اور اس نے کچھ کام بھی کئے یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں جب اس نے اپنا ڈیرا شہر دہلی سے دور، جمنا کے کنارے اوکھلے کی بستی کے قریب جمایا تو اس نے تعلیم کی برکتوں کے دروازے آس پاس کی دیہی بستیوں پر کھول دئے کہ قوم کی خدمت کا ایک اور گوشہ سامنے آیا۔ ذاکر صاحب نے اپنی بے پایاں محبّت، بے لوث جذبۂ خدمت اور درویشانہ زندگی کے طور طریقوں سے گاؤں والوں کا دل جیت لیا اور وہ ان کے لئے امید اور حوصلے کا روشن مینار بن گئے۔ آج وہ نہیں ہیں تو وہ بھی ہم جامعہ والوں کی طرح اپنی زندگی کو سنسان پاتے ہیں۔

آج یہ جو جامعہ ملیہ قائم اور ترقی کی راہ پر گام زن ہے، یہ سب ذاکر صاحب کا کارنامہ ہے۔ انھوں نے جامعہ کو زندہ نہ رکھا ہوتا تو جامعہ نگر کی یہ بستی کہاں ہوتی۔ ذاکر صاحب کا قوم کے لئے یہی وہ تحفہ ہے جس میں ان کی پوری شخصیت کا نچوڑ، ان کا خون جگر شامل ہے، اس خون جگر میں یقین اور ایمان کا وہ گہرا رنگ ہے جو سچی مذہبیت، بے پناہ خداترسی اور بے میل دینداری سے حاصل ہوتا ہے، اور سخت سے سخت حالات میں بھی اپنی اصلی صورت میں باقی رہتا ہے۔

ذاکر صاحب بہت اچھے مقرر تھے۔ ان کی تحریروں میں جذبے اور فلسفے کے امتزاج سے ایک خاص قسم کی گرمی اور حرارت کا احساس ہوتا تھا۔ ادب اور فن کی باریکیوں کے شناسا تھے۔ علم و مذہب کے رمز آشنا اور تعلیم و تہذیب کی برکتوں سے واقف تھے، انھیں ہر لحجہ خوب سے خوب ترکی تلاش رہتی تھی۔ وہ حُسن کے شیدائی اور فکر و عمل کی پاکیزگی کے محرم اسرار تھے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت، ان کا اندازِ گفتگو، یہ سب صفات ان کی بھرپور شخصیت کا جزو بن گئی تھیں۔ وہ چاہتے تو اپنی وجاہت، ذہانت اور شعلہ بیانی سے کام لے کر کامیاب سیاستدان بن جاتے لیکن ان کی طبیعت کی افتاد ایسی تھی کہ وقتی کامیابی پر قانع نہیں ہو سکتی تھی اس لئے انھوں نے اپنے لئے تعلیم کا میدان منتخب کر کے جامعہ ملیہ کو بنایا اور سنوارا کہ یہ وہ کار خیر تھا جو عرصہ تک باقی اور جاری رہنے والا تھا۔ ایسی طبیعتوں کا سوز و گداز صوفیوں کے دل کے سوز و گداز کی مانند ہوتا ہے کہ اس میں آج کے نقد کے بجائے کل کے فائدہ کی فکر اور تڑپ ہوتی ہے۔

ذاکر صاحب اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کی شخصیت کے نقش و نگار، ان کی سیرت کے خدوخال اور ان کے کارناموں کی مثال زندہ رہے گی اور ہمارے دلوں کو گرماتی اور اچھے کاموں پر آمادہ کرتی رہے گی۔ ہم جو یہاں جمع ہیں اپنے محبوب رہنما، اپنے مربّی اور محسن کو کبھی بھول نہیں سکتے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا یہ جلسۂ عام دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مراتب بلند سے بلند تر کرے۔ ان پر اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دے اور انھیں اپنے محبوب بندوں کی صف میں جگہ دے۔ یہ جلسہ ان کے متعلقین کے غم میں برابر کا شریک ہے اور خدا سے دعا کرتا ہے کہ

"اے رب العالمین ان کو صبر جمیل عطا فرما"